قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اِکہتّرواں سال

ستمبر 2014ء

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

تم دشمن کے مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ امکان بھر سامان حفاظت فراہم کرو۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو۔ تاکہ تم ان کے ذریعے ان لوگوں کو خائف رکھ سکو جو تمہاری ذات کے بھی دشمن ہیں اور نظامِ خداوندی کے بھی دشمن اور ان کے علاوہ انہی جیسے اور دشمنوں کو بھی جن کا ابھی تمہیں علم نہیں ہوا۔ اللہ کو ان کا علم ہے۔ (الانفال:60)

جلد 67 شمارہ نمبر 9 ستمبر 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: حج کا مقصد	ادارہ	3
متحرک نفسیات	راجہ عبدالعزیز	14
پرویز صاحب کا نظریہء حدیث وسُنّت	ملک منظور حسین لیل	22
تزکیۂ نفس اور زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم	خواجہ ازہر عباس	32
الھدایۃ والعرفان فی تفسیر القرآن بالقرآن	آصف جلیل	40
یہودی۔۔۔خدا کی ''خاص'' مخلوق؟	ڈاکٹر مہاتیر محمد	46

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Mursalaat* – Durus-al-Qur'an **By G.A.Parwez**

Parah 29: Chapter 28 **Translated by: Dr. Mansoor Alam** 51

دفتر کا پتہ B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546

E-mail: idara@toluislam.com

ناشر و چیئرمین

محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8

ادارہ

لمعات

ایک درس

حج کا مقصد

پرویز صاحب نے اگست 1981ء میں ایک درس حج کے موضوع پر دیا تھا۔ اس تقریر کو ایک بار پھر تحریر کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس درس میں حج کے مقاصد، موجودہ اقوامِ عالم کی حالت، امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل، اسرائیل اور فلسطین کی دردناک صورتِ حال کو جس طرح بیان کیا گیا تھا 33 سال گزرنے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ جیسے وقت کا دوران وہیں پر تھما ہوا ہے اور مسائل جوں کے توں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو ستمبر 2014ء کے لمعات کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے!

آپ نے یہ الفاظ ہر محراب و منبر اور ہر سٹیج اور پلیٹ فارم سے سنے ہوں گے، اور بار بار سنے ہوں گے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بارہا بار سنے ہوں گے، لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سنا ہوگا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کر سکتی ہو..... اس کے لئے اُسے غیروں کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہو..... وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سنتی ہیں تو استہزاء کی ہنسی ہنس کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو تو حل کر لو، اس کے بعد نوعِ انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا!

یہ درحقیقت ''مذہب'' کی ٹیکنیک ہے کہ وہ نہایت مقدس اور خوش آئند الفاظ کے ذریعے اپنے معتقدین کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے اور اُن کے ذہن کو کبھی اِس طرف نہیں آنے دیتا کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم معلوم کریں یا یہ سوچیں کہ ہم جو دعویٰ کرتے ہیں اُس کا عملی ثبوت کیا ہے۔ مذہب کا سارا دارومدار بلا مفہوم الفاظ کے دہرائے چلے جانے اور بلا نتیجہ رسومات ادا کئے جانے پر ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام بھی الدین نہیں رہا، مذہب بن چکا ہے، اس لئے ہم بھی نہ الفاظ کے مفہوم کی طرف آتے ہیں اور نہ ہی اپنے دعاوی کے عملی ثبوت کی طرف۔

اِس وقت تمام اقوامِ عالم گوناگوں مشکلات کا شکار ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک پرابلم کا حل قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کئے

چلا آ رہا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مری یہ کوشش قرآنی الفاظ' اصطلاحات' اور تصورات ونظریات کا متعین مفہوم پیش کرنے تک محدود ہے۔ عملی نتائج سے اس کے دعاوی کا ثبوت بہم پہنچانا میرے بس کی بات نہیں' کیونکہ وہ ثبوت تو قرآنی نظام کے قیام ہی سے بہم پہنچ سکتا ہے' اور نظام کا قیام کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ اُمت کی اجتماعی کوششوں ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ بایں ہمہ' میں شروع ہی سے اپنی ان کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ قوم کے اربابِ بصیرت اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اِس وقت ہم میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہو رہا ہے وہ مذہب ہے' دین نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے شاید آنے والی نسلیں استفادہ کر کے دین کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اقوامِ عالم متعدد' گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں..... میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مسئلہ کو لوں گا جو درحقیقت مشکل ترین مسئلہ ہے اور نوعِ انسان کے موجودہ مصائب اور ممکنہ تباہی کا موجب ہے۔ اور وہ ہے نیشنلزم۔ میں اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ خود اقوامِ مغرب اِس کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر مضطرب و بے قرار۔ لیکن انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس نشست میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے اس کا نظری حل کیا بتایا اور عملی پروگرام کیا تجویز کیا۔

☆.....☆.....☆

نیشنلزم

نوعِ انسان کی تمدنی یا معاشرتی زندگی کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی' مغرب کے علماءِ علم الانسان نے اس باب میں خاصی تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر منزل تک پہنچنے کا آغاز سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا**..... [10:19] ''نوعِ انسان شروع میں ایک اُمت' ایک جماعت' ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے''۔ ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور اس کے بعد قبیلوں میں بٹ گئے اور اس تفریق کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اُس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلکِ زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اِس کا نام نیشنلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوعِ انسان کو محیط ہے۔ اِس سے نہ کرۂ ارض' کرۂ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان' نوعِ انسانی کا فرد۔ کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کب اونگھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوعِ انسان کی یہی کیفیت ہے' اس میں نہ اقوامِ مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوامِ مشرق کی تمیز۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیار

قرآنِ کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی جس مصیبت کا شکار ہوگئی تھی اُس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ ..... [2:213]

چونکہ نوعِ انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے بعثتِ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برداری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا ضابطہ لاتے تاکہ وہ اُس کی رُو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

عالمگیر برادری

یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروانِ انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھالنا۔ اس کے لئے وحی نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک اُمت کے افراد ہیں۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری اُمت کے افراد۔ اِسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیاسی اصطلاح میں اسے دوقومی نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا، لیکن اِس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی۔ اُنہوں نے ماں باپ، برادری، قوم اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی اُمت کی تشکیل کی اور اُس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لئے ایک محسوس مرکز کا وجود لابُدّ ہوتا ہے۔ انہوں نے وحیٔ خداوندی کی راہنمائی میں مکہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعبیر کیا، جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اِس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ [3:96]

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کی منزلِ مقصود کے لئے نشانِ راہ تھا۔

اِسے، تمام انسانی نسبتوں سے بلند و بالا قرار دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ''اپنا گھر'' (بَيْتِيَ 2:125) کہہ کر پکارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر ''اپنی'' کہہ کر پکارا ہے اس

کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی' نہ اس پر کسی کا قبضہ ہوسکتا ہے۔ (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض (اللہ کی زمین)۔

للناس کا مقصد

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو الناس (نوعِ انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اِس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآنِ کریم میں آئی ہیں اُن میں ہر جگہ ''الناس'' ہی کہا گیا ہے۔ یہ اِس لئے کہ' جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' وحی خداوندی کا مقصود و مطلوب نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لئے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے ''للناس'' ہی کہا جانا چاہئے تھا۔

اور یہی قرآن نے کیا۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ..... [5:97]

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تا کہ اس مرکزیت سے نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اِنسانیت' قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوسکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سپر نیشنز..... یعنی بڑی مہیب قوتوں کی مالک قومیں۔ اور دوسری' کمزور اور غیر نشو و نما یافتہ (Undeveloped) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سہارے کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے۔ یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود سپر پاورز اپنی قوت کے لئے اِن کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں' وہ اُتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں' لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکیں۔

لیکن اگر قومیتوں کے مٹ جانے کے بعد نوعِ انسان اُمتِ واحدہ بن جائے تو اُسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اوّلین ثمرہ۔ یعنی قیاماً للناس۔ نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

اب آگے بڑھئے۔ اِس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی' سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی ہوئی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے تو افراد' خوف و ہراس کے جس جہنم میں زندگی گذارتے ہیں' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع و عریض کرۂ ارض پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا مامن ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامون سمجھ لے۔ کعبے

کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا:۔

جائے اِمن

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ..... [2:125]

اور ہم نے کعبہ کو نوعِ انسان کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا خوف وخطر نہ ہو۔

دوسری جگہ ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ..... [3:97] ''جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے' اُسے امن کی ضمانت مل جائے گی''۔

بات واضح ہے' دنیا میں خوف وخطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے۔ جب اِن کی جگہ ایک ایسی اُمت وجود میں آ جائے گی جس میں یہ تفریق نہیں ہوگی تو وہ بھائیوں کی طرح امن وسلامتی سے رہے گی۔ اسے نہ کسی خارجی خطرہ کا اندیشہ ہوگا' نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچئے کہ اس سے یہ کرۂ ارض جو اس وقت جہنم زار بن رہا ہے' کیسا امن وسلامتی کی جنت بن جائے گا!

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ' دوسرے ملک میں قدم تک نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ (VISA) حاصل نہ کر لے۔ کعبہ کے متعلق کہا:۔

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ..... [22:25]

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے' اس گھر کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں' کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں' کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (ربّ الناس) کا گھر ہے' اس لئے اس کے دروازے ہر انسان کے لئے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آ جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے بعد یہ دعا مانگی تھی کہ اس خطہ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا' جو لوگوں کے لئے وجہِ کشش ہو سکے۔ بارِ الٰہا! تو ایسا کر دے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور وہ فوج در فوج اِدھر آنے لگ جائیں (14:37)۔

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نوعِ انسان کے لئے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام پر گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ گھر قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے یہ طے کیا ہے' تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے۔ اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح ''کعبہ'' سے مراد وہ نظامِ خداوندی' وہ قرآنی مملکت ہے' جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔

☆.....☆.....☆

حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آپ' صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو اُلٹ کر' چھٹی صدی عیسوی میں آ جایئے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لئے سب سے پہلے ایک اُمت تشکیل کی گئی جو رنگ' نسل' خون' وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمت کے وجود کا مقصد کیا تھا' اِسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا۔ جب کہا کہ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** .....[3:110] ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے''۔ غور کیجئے! جس طرح کعبہ کا مقصد نوعِ انسان کی فلاح و بہبود تھا اُسی طرح اس اُمت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (للناس) کی خیر طلبی تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لئے اس اُمت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی رُو سے اس اُمت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ..... [2:143]

اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمت بنایا جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی' نہ کسی سے یونہی کھنچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تم نوعِ انسانی پر نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت کی طرف نہ اُٹھنے پائے۔ اور تم پر تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسولؐ) نگاہ رکھے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کر لو۔

یہاں پھر ''**شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ**'' کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان پر نگران۔ اِن خصوصیات کی حامل اُمت کو ''ملتِ ابراہیمیؑ'' (6:162) کی پیروکار کہہ کر پکارا گیا' یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمت۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا: **إِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا** ..... [2:124] ''نوعِ انسان کی امامت (Leadership) تمہارے حصے میں آئے گی''۔ اور اسی بنا پر اس اُمت سے کہا: **وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى** ..... [2:125] ''تم منصب و مقامِ ابراہیمیؑ کے حصول کو اپنی تگ و تاز کی جولاں گاہ بناؤ''۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو نوعِ انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے' جس کا مرکز کعبہ ہے' عالمگیر انسانیت کی لیڈرشپ حاصل کرو۔

حج

اِس اُمت نے جو نظام قائم کیا تھا' اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر تھی (42:38)۔ اِس مشاورت کی روزمرہ کی شکل تو صلوٰۃ کے اجتماعات تھے..... آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے (42:38)۔ لیکن پوری مملکت کے مسائل کے لئے مشاورت کے اجتماعات اِس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالمگیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ اُمت کے اس عالمگیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا..... اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کئے جانے ضروری تھے انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماعِ عظیم کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ **وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ** ..... (22:27)

''تم اعلان کردو تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لئے آئیں''۔ اس اُسوۂ ابراہیمیؑ کے اِتباع میں اِس اُمت پر بھی یہ فریضہ عائد ہوگیا کہ وہ اِن اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو اُمت کی باہمی مشاورت کے لئے ہوں گے' لیکن ان میں شرکت کے لئے تمام انسانوں (الناس) کو دعوت دی گئی ہے یہ بحیثیت مبصر شریک ہوں گے۔ اِس سے مقصد کیا ہے' اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ..... (22:27) ''حج کے لئے تمام لوگوں کو دعوت دو''۔ اسی طرح اُمتِ مسلمہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ..... (3:97) ''جو لوگ بھی (الناس) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں' انہیں چاہئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے (للہ) حج کے اجتماع میں شرکت کریں''۔ آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی الناس کہا ہے' اسے مؤمنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانہ قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرتِ ابراہیمؑ تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ لیکن جس طرح' جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند و بالا پروگرام کے عملی اجزاء بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماع نے بھی (کم و بیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی' اور حج ابراہیمیؑ کے مناسک اور شعائر' مشرکانہ اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے۔ بایں ہمہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے' تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا' اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور روک دینے کے بھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں' علاوہ دیگر امور قبائل کے باہمی جھگڑے نمٹائے جاتے تھے۔ اور زیادتی کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روکنا تلوار کے ذریعے نہیں ہوتا تھا' دلائل و براہین کی رُو سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حجت ہے جس کے معنی ''دلیل'' کے ہیں۔ اِس جہت سے قرآنی دلائل کو الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ..... (6:149) کہا گیا ہے۔ اِس لفظ کے اِن بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آجاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت سے مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا' اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

حج اسلام

قرآنِ کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا' بلکہ اسے دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتح مکہ سے پہلے (7ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا اس لئے وہاں' قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد 8ھ کا حج تو کم و بیش سابقہ روش پر ادا ہوا۔ لیکن 9ھ میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اِس میں حضور ﷺ خود تو تشریف نہیں لے گئے' لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کو نمائندہ مملکتِ قرآنیہ کی حیثیت سے' قافلۂ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم و بیش تمام

سابقہ رسوم ومناسک کو برقرار رکھا' لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزشوں سے پاک اور صاف کر کے۔ اس سے پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلانِ عظیم تھا جو مدینہ کی اسلامی مملکت کی طرف سے' غیر مسلموں (بالخصوص قریش) کے ساتھ تعلقات کا منشور تھا اور جو سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔ 10ھ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتمآب ﷺ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضور ﷺ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے صحیفۂ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خودساختہ' رنگ ونسل' خون' زبان' وطن' قومیت' ذات پات' برادری' قبائل' ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر' خالص ایمان کی بنیادوں پر' انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع' انہی مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع وعریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ' ان لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی۔ جنہیں ارکان وعمالِ حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دور دراز علاقوں سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا' اس لئے میدانِ عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی جہت سے اسے عرفات کہتے تھے۔ (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہِ مملکت یا اُس کا نمائندہ' اپنے خطاب میں اس پروگرام کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد' یہ نمائندگانِ مملکت' منیٰ کے میدان میں جمع ہوتے۔ وہاں اور تین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور وخوض کرتے۔ امورِ مملکت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغیثین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل وحجت کی رُو سے کیا جاتا' دھاندلی اور سینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر' یہ نمائندگان' اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

قربانی؟

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مکہ' اس وادی میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا (14:37)۔ اس علاقہ میں اگر لاکھوں انسانوں کا اجتماع ہو تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا؟ قرآن کریم اس قسم کے اہم سوال کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ اس اجتماع میں شرکت کرنے والے اپنی ''خوراک'' اپنے ساتھ آپ لائیں..... اور ظاہر ہے کہ گوشت سے بہتر خوراک کونسی ہوسکتی تھی؟ اس نے کہا کہ یہ آنے والے کچھ فالتو اونٹ اپنے ساتھ لائیں۔ آتے وقت ان پر بے شک سامانِ تجارت وغیرہ لاد لیں' اور یہاں پہنچ کر انہیں ذبح کریں۔ اُن کا گوشت خود بھی کھائیں' اور مکہ کے اُن غرباء کو بھی کھلائیں جنہیں عام حالات میں گوشت نصیب نہیں ہوتا۔ سورۂ حج کی آیات (22:28; 22:33; 22:36) میں یہ تمام تفصیل درج ہے۔ ان کے لئے قربانی کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ (نہ ہی ان جانوروں کے متعلق جنہیں بقرعید پر' قربانی کہہ کر ذبح کیا جاتا ہے)۔

اِس کے بعد حج کے اُس بنیادی مقصد کی طرف آیئے جس کی تشریح کو ہم نے قصداً اس مقام کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دین کے مقاصد محض نظری تصورات یا ذہنی عقائد نہیں ہوتے' وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اور دین کے دعاوی کا ایسا عملی ثبوت بنتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حج کے سلسلے میں بھی قرآنِ کریم نے اس کا اسی قسم کا مقصد بتایا۔ سورۂ حج میں

ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا:۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ○ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ..... (22:27-28)

تم لوگوں میں اعلان کردو کہ وہ حج کے لئے یہاں آیا کریں..... دنیا کے دور دراز گوشوں سے، لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پاپیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی سے تھک کر چور ہو جائیں۔

وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی (یعنی نوع انسان کی) منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

نوعِ انسان کی منفعت

اِس میں ''لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ''..... کے الفاظ بڑے گہرے غور و تدبر کے متقاضی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ لوگ آئیں اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ اس چیز کا ہو سکتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آجائے۔ یہ دعوت ''الناس'' کو دی جاتی تھی جس میں اُمتِ مسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ اِس اُمت کے افراد یہ دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے اور غیر مسلم بھی اس کا مشاہدہ کر لیں کہ یہ نظام عالمگیر انسانیت کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ یہ نفع سامانیاں بھی ان کے سامنے محسوس شکل میں آئیں گی۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے حسنِ عمل۔ کارِ خیر۔ ''ثواب'' کے کاموں کے پرکھنے کا ایک ہی معیار بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (13:17) ''دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان (الناس) کے لئے نفع بخش ہو''۔ دین اور اس کے ارکان و شعائر کی علت یہ ہے کہ ان سے ایسے نتائج مرتب ہوں جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت کا موجب ہوں۔ حج کے اجتماع میں ان منفعت بخش نتائج کو سامنے لایا جاتا تھا، اور اسی کے لئے تمام انسانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ.....

قرآنی نظامِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعض فنی اور ٹیکنیکی معاملات میں اُن سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایسا کیا کرتے تھے، اور اس زمانے میں غیر مسلم مکے میں آیا جایا کرتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام یوسفؒ۔ بحوالہ شبلی نعمانیؒ)۔ غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں مبصر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو ان مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے (22:25)۔ اسی بنا پر مشرکینِ مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا (9:3; 9:28)۔

بہرحال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوعِ انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

ہمارا حج

یہ تھا اجتماعِ حج کا مقصد۔ اُس زمانے میں دین اپنی اصلی شکل میں موجود تھا' لیکن جب وہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کے مقاصد نگاہوں سے اُوجھل ہو گئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دین کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعائر اور مناسک کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھتا ہے' اور ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکامِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدتمندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو اُن کے اپنے ہی دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کئے جاتے ہیں' یہ دیکھے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لئے اِس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ' نسل' زبان' خون' وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے) اُسے پھر سے ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لئے ایک نظام تجویز ہوا تھا' جس کا مرکز کعبہ تھا' اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے' اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ' بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں۔ چالیس' پچاس ہزار کا انبوہِ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لئے وقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس' پچاس ہزار حاجیوں کے لئے (مملکت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) زرِ مبادلہ جس قدر صرف ہوتا ہے' وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی' شدت کی گرمی اور دیگر ناسازگار حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں۔ اِس میں مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت' توانائی' روپیہ کے اس صرف اور اس قدر جانکاہ مشقتوں کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ ان افراد کا جذباتی اطمینان کہ ہم نے ایک فریضہ ادا کر لیا ہے۔ محض افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی بنا پر اسلام کو ایک منفرد نظامِ حیات قرار دیا جا سکے! اِس قسم کا اطمینان تو تمام اہل مذاہب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے اور کر لیتے ہیں!

علاوہ ازیں دنیا کے تمام مسلمان اُسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح غیر مسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افراد حج کے اجتماع میں بھی اپنے اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اِس کی شدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سال ادھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حریم کعبہ میں

بھی' امامِ کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے.....اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت ہمارے اس اجتماع کی جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ دین جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کا (حج تو ایک طرف) نمازوں تک کا اجتماع' مخالفین کے دلوں میں' دھڑکن پیدا کر دیا کرتا تھا اب کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کی قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ ذخار میں اسرائیلی مملکت کی حیثیت خس وخاشاک سے زیادہ نہیں۔ سالہا سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفات کے میدان میں رو رو کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا بیڑا غرق ہو' اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے ''مذہب کے حج'' کا نتیجہ۔ الدین کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلان پر دنیا کی بڑی سے بڑی غلط کوش قوم کپکپانے لگ جاتی! اب یہ اُمت' غیر مسلموں کی چھوٹی سے چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی ''مغضوب علیہ'' قوم ہیں اس لئے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ کمزور انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

اُمت کی یہ حالت ہے اور اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیئے جاتے ہیں کہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ارکانِ اسلام کی رسمی طور پر پابندی کرتے رہیں اور ان کی غرض وغایت اور مقصود ومطلوب کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف مملکتیں بھی اپنا اپنا مفاد مضمر دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کے فروغ کا سامان بہم پہنچا کر انہیں تاکید کرتی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیشِ نظر' ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا: ؎

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز)

ابلیس کا یہ سحر اس وقت ٹوٹے گا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائے گی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ انتباہ کارفرما ہو کر رہے گا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38)۔

اگر یہ (قرآن سے اسی طرح) رُوگرداں رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی' اور وہ اِن جیسی نہیں ہوگی۔

خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی اٹل ہوتی ہیں! اس استبدالِ قومی میں جو تباہی آتی ہے' وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام

پرویز (اگست 1981ء)

☆.....☆.....☆

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

چوتھی قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

(محترم قارئین جیسا کہ گذشتہ شمارہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ راجہ عبدالعزیز صاحب مختصر علالت کے بعد انتقال فرما گئے تھے۔ ہم نے ''متحرک نفسیات'' کے سلسلہ کے اگست کے مضمون کو آخری قسط قرار دیا تھا لیکن ان کے اعزہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس سلسلہ کے مزید مضامین قلم بند کر چکے تھے جن کا مسودہ موجود ہے۔ لہٰذا ''متحرک نفسیات'' کے سلسلہ میں اُن کے مزید مضامین سات آٹھ ماہ کی طلوع اسلام کی اشاعتوں میں شائع ہوتے رہیں گے۔ اس سلسلہ کی چوتھی قسط حاضرِ خدمت ہے۔ ادارہ)

گذشتہ قسط میں نفسیات کے مختلف ادوار میں اِرتقاء کے جائزے میں قدیمی نفسیات کا تذکرہ ہوا۔ اس ضمن میں اگر برصغیر پاک وہند پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال ق م ہندوستان میں ابتدائی نفسیاتی نظریات تانترا یوگا کے فلسفے کی شکل میں موجود تھے۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ذہن اور جسم ایک دوسرے میں مدغم ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ جسمانی ورزشیں ذہن کی نشوونما کرتی ہیں اور ذہنی مشقیں جسمانی اعضاء کو متاثر کرتی ہیں۔ بعد میں برہمنوں نے اس عوامی فلسفے کے خلاف ''ویدانت'' کا فلسفہ پیش کیا جس میں شعور اور روح کو جسم سے علیحدہ اور اعلیٰ قرار دیا اور آواگان کا نظریہ پیش کیا یعنی روح ایک ہی ہوتی ہے اور ہر جنم میں اس کا جسم تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ برہمن کے ان خیالی تصورات کے ردِعمل میں یوگا کے فلسفے نے مزید ترقی کی اور سنکھیا کا ترقی یافتہ فلسفہ سامنے آیا جس کے مطابق شعور، ذہن اور اعضاء مادے کے ارتقاء سے پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے روح کو رد کر دیا اور حواس کو علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ یہاں ایک اہم بات کا ذِکر کرنا مناسب رہے گا کہ برصغیر کے قدیمی فلسفے میں شعور کا تعلق دماغ سے تھا۔ جبکہ کئی سو سال بعد ہندوستانی اور یونانی فلسفیوں نے شعور کا تعلق دِل سے جوڑ دیا تھا۔

نفسیاتی ارتقاء کی تاریخ میں یونان کی مرکزی حیثیت ہے۔ کیونکہ ماہرین نفسیات کے مطابق نفسیات کی پہلی باقاعدہ تحریر ارسطو نے 'De Anima' (روح یا نفس) یہاں پر ہی لکھی تھی۔ دراصل چھٹی صدی ق م تک یونان میں دورِ غلامی کا آغاز ہو چکا تھا۔ چونکہ جسمانی محنت ومشقت غلاموں کے لئے مخصوص تھی اس لئے یہاں پہلی دفعہ جسمانی محنت سے آزاد ایک دانشور طبقہ معرضِ وجود میں آ گیا جو اپنا زیادہ وقت ذہنی کاموں میں گزارتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ غلامی کو معاشرے کا جزوِ لاینفک سمجھتے تھے۔ اسی دانشور طبقے نے

مٹی، پانی، آگ اور ہوا جیسی مادی اشیاء کو دنیا کا بنیادی عنصر قرار دیا۔ ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ نظریات دیما کریتس کے تھے۔ اس کے مطابق روح سمیت دنیا کی ہر چیز چھوٹے چھوٹے متحرک جواہر سے بنی ہے۔ ان ہی فلسفیوں میں سے بعض نے روح کو جسم سے الگ کر کے روح کو جسم سے اعلیٰ تر قرار دیا۔ ان میں سقراط، افلاطون اور ارسطو نمایاں فلسفی تھے۔ سقراط نے روح کو خود آگہی کا دوسرا نام قرار دیا جس کے ذریعے انسان اچھائی اور برائی میں تمیز کرتا ہے۔ افلاطون نے روح کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کہا کہ سب سے اعلیٰ حصہ معقول اور سوچنے والی روح ہے جس کا جسمانی خواہشات، جذبات اور احساسات سے تضاد ہے۔ ارسطو کی مذکورہ بالا تحریر کے بعد نفسیات یعنی علم النفس نے ایک علیحدہ شعبہ علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس لحاظ سے ارسطو دنیا کا پہلا نفسیات دان اور علم نفسیات کا بانی ہے۔ اس نے بہت سے ایسے موضوعات کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے جو آج بھی نفسیات کے اہم مسائل ہیں۔ مثلاً انسان اور جانوروں میں پیدائشی طور پر جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ جن میں بھوک، پیاس، جنس، غصہ، خوف اور جسمانی آرام کی خواہش شامل ہیں۔ یونانی فلسفیوں نے ہندوستانی فلسفیوں کے برعکس روح اور ذہن کے مسائل کو جنوں اور بھوتوں کی بجائے علمی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی جن کا نفسیات کی تاریخ میں گہرا اثر پڑا۔

عہد وسطیٰ (Middle ages) میں دور غلامی کی جگہ جاگیرداری نظام رائج تھا۔ یہ زمانہ قدیم یونانی ترقی یافتہ تہذیب اور جدید یورپی صنعتی دور کا درمیانی دور تھا۔ اسے یورپ کی تاریخ کا بدترین اور سیاہ ترین دور قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں تحقیق اور آزاد فکر کی سختی سے حوصلہ شکنی کی گئی۔ ادھر مشرق میں مکہ کے مقام پر حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت بھی اسی دور میں ہوئی۔ نفسیاتی ارتقاء کی تاریخ کے تحت رفیق جعفر لکھتے ہیں۔ ''دوسری طرف ساتویں صدی عیسوی میں عرب قبائلی نظام سے ایک ترقی پذیر جاگیرداری نظام میں داخل ہوئے اور ایک روشن خیال نظریہ اپنایا۔ اسلام نے عربوں میں غور و فکر اور تحقیق کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ عرب میں سائنس اور فلسفے نے بے پناہ ترقی کی۔ ہم یہاں پر ان اہم فلسفیوں کا ذکر کریں گے جنہوں نے واضح نفسیاتی نظریات پیش کئے''۔ ان مشہور فلسفیوں میں پہلا نام ابن سینا کا ہے۔ وہ ماہر طب بھی تھے۔ انہوں نے اپنے طبی تجربے کی بنیاد پر یہ نظریہ پیش کیا کہ صحت مند افراد وہم سے بیمار ہو جاتے ہیں اور بیمار افراد قوتِ ارادی سے صحت مند ہو جاتے ہیں۔ ایما (Suggestion) اور نومیت (Hypnotism) کے ذریعے دوسروں میں بیماری پیدا بھی کی جا سکتی ہے اور ان کا علاج بھی کیا جا سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ الغزالی نے کہا کہ انسان قوتِ ارادی سے نفس امارہ کو نفس مطمئنہ میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ابن رشد کو عہد وسطیٰ کا عظیم ترین فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اپنی کتاب الانفس میں روح کو انسانی جسم کا حصہ اور فانی قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جانور حواس اور تخیل کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں جبکہ انسان ان کے علاوہ عقل بھی استعمال کرتا ہے۔ رفیق جعفر کے مطابق ''مسلمان فلسفیوں کا اہم تاریخی کردار یہ تھا کہ انہوں نے یورپ کے سیاہ ترین دور میں قدیم یونانی فلسفے خاص طور پر ارسطو کے نظریات کی سائنسی تشریح کی اور اس میں اضافہ کیا۔ یورپی فلسفیوں اور سائنسدانوں نے ان نظریات سے خاص طور پر ابن رُشد کے نظریات اور سائنسی طریقہ کار کو اپنایا اور اس سے یورپی سائنس اور تہذیب کو عروج حاصل ہوا''۔

یورپ میں 15 ویں صدی عیسوی تک جاگیرداری نظام کا زوال شروع ہو چکا تھا اور تجارت پر مبنی سرمایہ داری کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اس دور میں یورپی تحریک احیائے علوم اور جدید نفسیات کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ 16 ویں اور 17 ویں صدی میں دنیا کے عظیم ترین فلسفی

اور سائنسدان پیدا ہوئے۔ ان میں کوپرنیکس، برونو، گلیلیو، بیکن اور نیوٹن بھی شامل ہیں۔ ان سائنسدانوں نے جہاں سائنسی علوم میں بنیادی تبدیلیاں کیں وہاں سائنس کے بارے میں مذہب کی جاگیردارانہ تشریحات کو رد کر کے تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر سائنسی نظریات قائم کئے۔ جاگیرداری نظام کے مذہبی نمائندوں نے ان نظریات کو عیسائیت کے خلاف قرار دے کر ان سائنسدانوں پر بہت ظلم ڈھائے جن کی تفصیل میں اپنے پچھلے دو مضامین میں بیان کر چکا ہوں۔ سائنس میں اس پیشرفت کے نتیجے میں علم نفسیات میں بھی ترقی اور اضافہ ہوا۔ ڈیکارٹ کو جدید فلسفہ اور نفسیات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ارسطو کے زمانے میں قدیم غلامانہ نظام دم توڑ رہا تھا اور نیا جاگیردارانہ نظام جنم لے رہا تھا جبکہ ڈیکارٹ اس زمانے میں پیدا ہوا جب جاگیردارانہ نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس معاشرتی و معاشی کشمکش اور تضاد کا اظہار ان دونوں کے متضاد نظریات میں ملتا ہے۔ ڈیکارٹ نے جسم کو ذہن سے الگ قرار دیا۔ اور کہا کہ جسم مشین کی طرح میکانکی اصولوں پر کام کرتا ہے جبکہ ذہن یا روح ابدی اور غیر مادی ہیں اور اولین حیثیت رکھتے ہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک یورپ میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام نے تقویت حاصل کر لی تھی۔ اس کے نتیجے میں سائنسی تحقیق میں خاصا اضافہ ہوا' کیمیا' طبعیات' نفسیات اور حیاتیات کے علوم خصوصاً حیاتیات کی دو شاخوں' عضویات (Physiology) اور عصبیات (Neurology) نے بے پناہ ترقی کی۔ جرمن سائنسدان ہرمن ہولٹز نے عصبی لہر (Nerve Impulse) کی رفتار کی پیائش کی اور مہیج (Stimulation) کے عمل اور حرکی عمل کے درمیان وقفے یعنی مدتِ ردعمل (Reaction Time) کی بھی پیائش کی۔ اسی دوران علم نفسیات پر دوسرا اہم اثر جرمن ماہر طبعیات گسٹاف فیشنر کی تحقیقات کے نتیجے میں ہوا۔ اس نے ایک اور جرمن ماہر عضویات (Ernest Weber) کی تحقیقات کی بنیاد پر (Weler's Law) قائم کیا اور اپنی تحقیقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ طبعیاتی دنیا اور ذہنی اعمال کے درمیان ایک قطعی تعلق موجود ہے۔ اس تعلق کی پیائش کو فیشنر نے نفسی طبعیات (Psycho Physics) کا نام دیا۔ ان سائنسی تجربات اور نظریات کے زیر اثر نفسیات ایک آزاد سائنس کے طور پر وجود میں آئی۔ 1873ء میں جرمنی کے ہی ایک ماہر عضویات اور ماہر نفسیات ولہلم ونٹ (Wilhelm Wandt) نے اپنی کتاب "The Principles of Physiological Psychology" شائع کی جس میں پہلی دفعہ نفسیات کو ایک نئی سائنس کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس لحاظ سے ونٹ کو سائنسی یا تجرباتی نفسیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ 1875ء میں اس نے لائپزنگ یونیورسٹی جرمن میں دنیا کی پہلی نفسیاتی تجربہ گاہ قائم کی اور اسی سال امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمز نے امریکہ کی ہاورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کی پہلی تجربہ گاہ قائم کی تھی۔

انسانی تاریخ میں جب بھی کوئی نیا علم اور نئی سائنس وجود میں آتی ہے تو اس کی نوعیت' اس کے دائرہ کار اور اس کی تحقیق کے طریقہ کار کے بارے میں مختلف نظریات پیدا ہو جاتے ہیں اور ان علوم کے ماہرین مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور اپنے مخصوص نظریات پیش کرتے ہیں۔ نفسیات کی سائنس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ بیسویں صدی میں اس علم کے بھی مختلف مکاتبِ فکر وجود میں آ گئے۔ ان کا مختصر جائزہ یوں ہے۔ ترکیب پسند نفسیات:۔ اس کے بانی ونٹ نے انسانی ذہن اور تجربے کا جائزہ لیا اس مقصد کے لئے اس نے مشاہدہ باطن (Introspection) کا طریقہ استعمال کیا۔ انفرادی تفریق کی نفسیات:۔ اس کے بانی گالٹن نے مختلف

معاشروں میں لوگوں میں فرق کی پیائش کی اور ذہنی صلاحیتوں' تصورات اور تلازم (Association) کی پیائش کے طریقے دریافت کئے۔ تفاعل پسند نفسیات (Functional Psychology):۔ امریکی فلسفی اور ماہر نفسیات ولیم جیمز پہلا نفسیات دان تھا جس نے ڈارون کے حیاتیاتی نظریات کی اہمیت کو سمجھا اور کہا کہ انسانی شعور اِرتقاء کا نتیجہ ہے (ماہر حیاتیات اور ماہرین نفسیات کا اس بارے میں اختلاف ہے) کردار یت پسند نفسیات Behavioural Psychology:۔ امریکی ماہر نفسیات جان وائسن نے یہ انتہا پسندانہ نظریہ پیش کیا کہ ذہن اور شعور جیسے تصورات غیر سائنسی ہیں اس لئے نفسیات کو کردار یعنی مہیج اور ردعمل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن بعد میں خود کردار پسندوں نے ان نظریات کو مسترد کر دیا اور سوچ' جذبات اور دوسرے ذہنی عوامل کو انسانی کردار کا حصہ قرار دیا۔ تشکلی نفسیات (Gestalt Psychology) جسٹالٹ کا لفظی مطلب ترتیب یا شکل ہے۔ ان ماہرین کے مطابق نفسیات کا مقصد ترتیب کے بنیادی عناصر' ذہن' سوچ اور عمل کی وحدت وغیرہ کا تجزیہ کرنا ہے۔ تحلیل نفسی (Psycho Analysis) یہ اصطلاح ماہر طب نفسی سگمنڈ فرائڈ نے واضح کی تھی۔ اس نے ذہن کے لاشعوری محرکات کی طرف توجہ دلائی۔ ذہنی مریضوں کے علاج کے دوران فرائڈ نے ذہنی عوامل کے تجزیئے کے دوران یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی ذہن کا بیشتر حصہ لاشعوری محرکات پر مشتمل ہے جو کہ شعور پر حاوی ہے۔ شعور' لاشعور' تحلیل نفسی اور فرائڈ کے دیگر اہم نظریات پر تفصیلی بحث آگے چل کر آئے گی۔ یہاں پر اس کے ایک اہم نظریئے کی طرف اشارہ کرنا مناسب رہے گا کہ اس کے مطابق فرد کی شخصیت بچپن کے واقعات اور تجربات سے متعین ہوتی ہے اور ان میں جنسی محرکات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا کوئی نظریہ بنیادی لحاظ سے جنسیات سے خالی نہیں ہے۔

بہرحال 1940ء کے بعد نفسیات پر ان مختلف مکاتبِ فکر کا اثر کم ہوتا گیا اور مختلف نظریات کو یکجا کر کے ایک مربوط نفسیاتی سائنس قائم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پچھلی تقریباً نصف صدی میں کچھ نئے مکاتبِ فکر وجود میں آئے ہیں جنہوں نے حسبِ معمول سابقہ مکاتبِ فکر کے نظریات اور تحقیقات پر تنقید کی ہے۔ ان میں وقوفی (Cognitive) نفسیات کا کہنا ہے کہ صرف مہیج اور ردعمل کا مطالعہ کافی نہیں ہے بلکہ فرد کے اندرونی ذہنی عوامل کا مطالعہ لازمی ہے۔ وقوفی نفسیات ان سارے طریقوں کا مطالعہ کرتی ہے جن سے فرد معلومات کا ادراک کرتا ہے' ان کی تشریح کرتا ہے' انہیں جمع اور ان کو استعمال کرتا ہے۔ اس نفسیات کے ایک اہم رکن ژان پیاژے نے بچوں کی سوچ' ان کی زبان' ذہانت' اخلاقی جانچ پڑتال کرنے کی صلاحیت اور دیگر ذہنی خصوصیات کی نشوونما کے بارے میں اہم معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وجودیت پسند (Existential) نفسیات کے ماہرین نے فرانسیسی فلسفی ژاں پال سارتر (جس کا ذِکر پہلے بھی ہو چکا ہے) اور دوسرے وجودیت پسند فلسفیوں سے اِستفادہ کیا ہے۔ اس نظریئے کے مطابق آج کا انسان بے مقصدیت اور بیگانگی کا شکار ہے اور اسی وجہ سے وہ ذہنی بیماریوں' نشے کی لت اور دیگر مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ وجودیت پسند نفسیات کا مقصد فرد کو اپنی پہچان کرانا ہے تاکہ وہ زندگی میں کوئی مقصد پا سکے اور اس کے حصول کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکے۔

انسانیت پسند (Humanistic) نفسیات کا مکتبہ فکر وجودیت پسند نفسیات کے خاصا قریب ہے۔ دونوں کے نزدیک فرد کو اپنی صلاحیتوں سے آگہی حاصل کرنی چاہئے تاکہ اس کی تکمیل ہو سکے۔ البتہ وجودیت پسند نفسیات' فرد کی شناخت اور قوت ارادی پر زور دیتی ہے' جبکہ انسانیت پسند نفسیات ذہن اور جسم کی وحدت' الفاظ کے بغیر تجربات حاصل کرنے' دوسروں سے رابطہ کرنے اور فرد کی بے

ساختگی پر زور دیتی ہے۔ اس مکتبہ فکر کے بانی امریکی ماہر نفسیات ابراہام ماسلو کے مطابق فرد کے بنیادی تحسات (Sensations) یا مہیج اور ردعمل کے مطالعہ یا لاشعوری محرکات کے تصورات سے انسان کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ انسان شعور، تخلیقی عناصر اور انفرادی خصوصیات کا حامل ہے۔ ماسلو کا کہنا ہے کہ نفسیات داں کو جانوروں، ذہنی مریضوں اور افراد کی منفی خصوصیات کو پوری نوع انسانی پر چسپاں نہیں کرنا چاہئے بلکہ انسان کو سمجھنے کے لئے عام صحت مند اور تخلیقی افراد کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

نفسیات کے ان مختلف مکاتب فکر کے علاوہ ان کی مختلف شاخیں بھی موجود ہیں۔ ان میں انسانی نشوونما کی نفسیات، معاشرتی نفسیات، صنعتی نفسیات، کلینکل نفسیات، جرائم کی نفسیات، عضویاتی نفسیات، تقابلی نفسیات، طبی نفسیات، ماحولی نفسیات، تنظیمی نفسیات اور تعلیمی نفسیات وغیرہ شامل ہیں۔ نفسیات کی شاخوں کو خالص یا بنیادی موضوعات اور اطلاقی (Applied) موضوعات میں تقسیم بھی کیا جاتا ہے۔ خالص موضوعات کے مطابق ماہر نفسیات سائنسی حقیقت جاننے کے لئے تجربات کرتا ہے اور انہیں سائنسی اصولوں پر پرکھتا ہے۔ جبکہ اطلاقی ماہر نفسیات موجودہ نفسیاتی اصولوں کو کسی عملی میدان (تعلیم وصنعت وغیرہ) میں استعمال کرتا ہے۔ کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ عمل اور نظریئے کے گہرے تعلق کی وجہ سے نفسیات کی مختلف شاخوں کو خالص اور اطلاقی پہلوؤں میں تقسیم نہیں کرنا چاہئے۔

نفسیات کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسانی کردار اور ذہن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ حقائق دریافت ہوں۔ تاکہ توہم پرستی کی بنیاد پر مبنی مفروضات اور نظریات کی حوصلہ شکنی ہو اور ان پر تحقیق وتجزیہ کے بعد اگر ٹھوس سائنسی شہادتیں فراہم نہ ہوں تو ان مفروضات کو یکسر مسترد کردینا چاہئے۔ نفسیاتی تحقیق کا بنیادی طریقہ مشاہدہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ابتداء میں انسانی ذہن اور شعور نفسیات کا موضوع قرار پائے اور ان کے لئے مشاہدہ باطن (Introspection) کا طریقہ استعمال کیا گیا۔ لیکن بعد میں جب قابل مشاہدہ اور قابل پیمائش کردار (Behaviour) کو نفسیات کا موضوع قرار دیا گیا تو معروضی (Objective) مشاہدہ نفسیاتی تحقیق کا اہم ترین طریقہ بن گیا۔ مشاہدے کے اس طریقے میں دوسروں کی حرکات وسکنات کا براہِ راست مطالعہ کیا جاتا ہے۔ باقی سائنسی علوم کی طرح نفسیات بھی اس حقیقت کا اقرار کرتی ہے کہ تمام واقعات اور اعمال مخصوص قوانین کے تابع ہیں۔ انسانی کردار اور ذہن بھی مخصوص قوانین کے تحت تشکیل پاتے ہیں۔ نفسیات کا کام ان قوانین کو دریافت کرنا ہے تاکہ انسان کے نارمل اور غیر نارمل کردار کو سمجھا جاسکے۔ لیکن ان قوانین کی روشنی میں انسانی کردار کے بارے میں درست پیشین گوئی کرنا ممکن نہیں کیونکہ اختیار وارادہ کا حامل ہونے کے سبب وہ ایک ہی جیسے موقعوں پر مختلف افعال واعمال کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ جدید تحقیقات سے بھی یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کی سوچ وخیالات اس کے کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ بات تو خود انسان بھی نہیں جانتا کہ اس کی سوچ، اس کے تصورات وخیالات میں کب تبدیلی رونما ہوجائے۔

اس سلسلے میں ماسلو کے نظریات پر بعد میں بات ہوگی یہاں آلپورٹ کے وضع کردہ تصور ''خودمختار عمل'' (Functional Autonomy) کا مختصر حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ آلپورٹ کا کہنا ہے کہ تحرکی نفسیات کی مدد سے، خواہ یہ نفسیات کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، تمام انسانی اعمال کے عمومی تصور کا جواز تو مل جاتا ہے لیکن ایک منفرد شخصیت کے منفرد اعمال کی بنیادیں کلیتاً جبلت میں نہیں ملتیں۔ ان تشریحات سے انفرادی عمل، انفرادی محویتِ کار اور انفرادی دلچسپیوں پر قطعاً روشنی نہیں پڑسکتی۔

پروفیسر ساجدہ زیدی کا کہنا ہے کہ ''آلپورٹ کے دلائل میں کہیں ساختہ لزوم کی مثالیں ملتی ہیں' تو کہیں نیوراتی تبدیلی کی اور کہیں سماجی اثرات سے پیدا شدہ تبدیلی کی .....لیکن اس نظریئے کی صداقت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا مشاہدہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انسانی عمل کا ایک قابل توجہ حصہ خودمختار عمل کے زمرے میں آسکتا ہے۔ اس ضمن میں مزید تحقیقات ہمیں زیادہ روشنی دکھا سکتی ہیں''۔ آلپورٹ نے ایک دلیل میں بعض جانوروں مثلاً چوہوں وغیرہ پر تجربات کے نتائج سے ظاہر کیا ہے کہ جانوروں سے اجباری طور پر سرزد ہونے والے افعال بھی خودمختار اعمال ہی ہوتے ہیں۔ پروفیسر ساجدہ اس دلیل کی تردید کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ ''آلپورٹ کی یہ دلیل بھی کمزور ہے' کیونکہ خودمختار عمل کا نظریہ ہی اس نے انسانی عمل کی خودکاری ثابت کرنے کے لئے پیش کیا ہے۔ پھر جانوروں کے ''ساختہ لزوم'' (Conditioning) کی مثال سے ان کی تشریح کیے ممکن ہے۔ 'Conditioning' سے پیدا شدہ اعمال تو میکانکی ہوتے ہیں نہ کہ خودمختار''۔ کنڈیشنگ کا ترجمہ کچھ ماہرین نے ''تشریط'' یعنی مشروط بھی کیا ہے۔ ساختہ لزوم یا تشریط دراصل آموزش (Learning) سے منسلک ایک طریقہ کار ہے جس کے ذریعے جانوروں کو ایک مخصوص طرز کے ردِعمل کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار کو غلطی سے انسانی ذہانت اور آموزش کے مترادف قرار دے دیا گیا ہے۔ اور انسان کی صلاحیتوں کا تشریط کے حیوانی تجربات کی روشنی میں مطالعہ وتجزیہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حیوان کے باقی افعال کی طرح تشریطی عمل بھی جبلی عمل ہے۔ خوراک کو دیکھ کر حیوان کے منہ میں پانی آنا ایک فطری عمل ہے۔ جبلت جانوروں اور انسانوں میں ان کے اندر ہی ودیعت ہوتی ہے۔ اسے معروضی طور پر سیکھنا نہیں پڑتا۔ جبکہ ذہانت کا مسئلہ ایسا نہیں۔ ذہانت انسانی بچے کو مضمر (Dorment) شکل میں ملتی ہے۔ یہ ایک صلاحیت ہے جس کی انسانی بچہ آموزش (Learning) کے ذریعے نشوونما کرتا ہے جو ایک خودمختار عمل ہے میکانکی یا جبلی نہیں۔

کلاسیکل تشریط کا بانی ماہر عضویات ایوان۔ پی۔ پاولوف تھا۔ پاولوف کتوں کے نظام ہضم پر تجربات کر رہا تھا کہ اس نے اتفاقاً آموزش کا یہ طریقہ دریافت کرلیا۔ اس سارے عمل (Process) میں بنیادی کردار انسانی ذہانت' حیوانی جبلی تقاضا (بھوک)' گھنٹی یا روشنی اور خوراک یعنی سزا وجزا جیسے عناصر کا ہے۔ اس تجربے کے برعکس بی۔ ایف سکنر کے وضع کردہ عاملانہ تشریط (Operant Conditioning) کے تصور کے تحت دراصل ہوتا یوں ہے اور ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جاندار اپنی روزمرہ زندگی میں بہت سے اعمال کرتے ہیں اور اپنے حیاتیاتی تقاضوں اور ماحولی قوتوں کے زیر اثر کئی حرکات کرتے ہیں۔ اگر ایک حرکت یا عمل کے نتیجے میں انہیں کوئی پسندیدہ چیز ملے یا ناخوشگوار صورتحال سے چھٹکارہ مل جائے تو جاندار وہ عمل دہراتے ہیں۔ اس عاملانہ تشریطی عمل کے مطابق اگر ایک کتے کو کوئی خاص کرتب مثلاً گیند پکڑ کر لانے کے لئے سدھانا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب کتا مطلوبہ حرکت سرانجام دے یا اس حرکت کی تیاری کرے تو اسے کچھ انعام (کھانا وغیرہ) دیا جائے۔ اس دوران اس کی غیر مطلوبہ حرکت کو نظرانداز کیا جائے یا ان پر اسے سزا دی جائے تو کتا مطلوبہ حرکت پر مجبور ہو جائے گا۔ جانوروں کو سدھانے والے یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ جانوروں پر تجربات کے نتائج کسی حد تک تو انسانی مادی جسم کے مطالعہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں انسان کو منفرد صلاحیتوں مثلاً عقل وفکر' غور وتدبر' تصورات اور نظریات (Concepts) آموزش' ذہانت ونفسیات' تخیل' یاداشت' معنی' تربیت' عادات' ذہن وشعور' علوم اور اخلاقیات وغیرہ' وغیرہ کے تجزیات میں جانوروں پر کئے گئے تجربات ونتائج محض گمراہی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ شہزاد احمد

کے مطابق بھی تلازمیت کی قسمت میں ناکامی لکھی تھی اس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں ''سیکھنے کے عمل کے ساتھ بھی انصاف نہ ہوتا تھا کیونکہ جو تجربات کئے گئے تھے ان کا تعلق انسان کے واقعی عمل کے ساتھ بہت کمزور تھا''۔

قرآن پاک کے مطابق پیدائش کے وقت انسانی بچے کو کسی قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ وہ علم اپنے حواس اور قوت فیصلہ (ذہن) سے بتدریج حاصل کرتا ہے 16:78۔ بہت سے بڑے بڑے ماہرین نفسیات اور فلاسفہ بھی قرآن پاک کے اس موقف کو تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً فلسفے کی دنیا میں انگریز مفکر جان لاک کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''پیدائش کے وقت بچے کا ذہن ایک صاف تختی (Tabula Rasa) کی مانند ہوتا ہے۔ جس پر روزمرہ تجربات اور آموزش کے ذریعے اثرات نقش ہوتے ہیں یہ سادہ سے تجربات' بعد میں پیچیدہ صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ سبھی کچھ آموزش کے عمل کی وجہ سے ہوتا ہے''۔ ناصرہ فاروق انسانی شعور پر بحث کے دوران انسان اور حیوان کے فرق کا ذکر یوں کرتی ہیں۔ ''گدھ اور عقاب انسان کے مقابلے میں بہت دور تک دیکھ سکتے ہیں لیکن جو چیز دیکھی جا رہی ہوتی ہے اس کے لئے انسانی عقل و بصیرت بے پایاں ہو سکتی ہے یعنی انسان مستقبل میں ہونے والے واقعات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اسی کے سبب وہ پیشین گوئی بھی کر سکتا ہے۔ یہ سب انسانی شعور کے فروغ کے سبب ہوا۔ انسانی شعور کی ترقی میں زبان اور بول چال (مربوط گویائی) نے انسانی شعور کو مزید تقویت دی اور اس کے سبب انسان جانوروں کی دنیا سے علیحدہ اور بلند تر ہو گیا۔ یاد رہے انسانی شعور کی نشوونما کا عمل ابھی تک جاری ہے''۔ ایک مشہور امریکی ماہر نفسیات انسانی شخصیت کی خصوصیات پر بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''انسان نہ تو مشینی انداز میں سیکھے ہوئے افعال کا مجموعہ ہے اور نہ ہی لاشعوری جسمانی ضرورتوں کا مرقع' بلکہ اس کے اندر ایک بنیادی قوت تحقق ذات (Self Actualization) ہے' جو فرد کی نشوونما کے عمل کی نگرانی و راہنمائی کرتی ہے۔ اس کی تمام صلاحیتوں کو فروغ دیتی ہے اور ایک بھرپور شخصیت کی تشکیل کرتی ہے''۔

(Theory of Personality - By Carl Rogers) راجرز کے مطابق فرد ایک مربوط نظام کی حامل شخصیت ہے جس کی جھلک اس کے تمام اعمال میں نظر آتی ہے۔ تحلیل نفسی (Psycho Analysis) کے اکثر ماہرین جبریت کے قائل ہیں کیونکہ وہ انسانی شخصیت کا مطالعہ جانوروں پر کئے گئے تجربات کی روشنی میں کرتے ہیں کارل راجرز اور ابرہام ماسلو' جو انسانیت پسند نظریات کے حامل ہیں' کہتے ہیں کہ فرد ایک آزاد ہستی ہے۔ وہ روزمرہ کی زندگی میں اپنی مرضی اور آزادی سے عمل کرتا ہے۔ ہر فرد منفرد انداز سے نشوونما پاتا ہے اور وہ نشوونما کے لئے پہلے سے متعین مراحل سے نہیں گزرتا۔

آموزش بذریعہ سعی وخطا کا طریقہ ایک امریکی ماہر نفسیات ایڈورڈ لی تھارن ڈائیک م1949ء نے متعارف کرایا تھا اُس کا تعلق کردار پسند نفسیات کے مکتبہ فکر سے تھا اُس نے مشاہدہ باطن کو غیر سائنسی طریقہ قرار دیا اور کہا کہ جانداروں کے مطالعہ کے لئے ماہرین نفسیات کو صرف قابل مشاہدہ کردار کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ جانوروں کے کردار کو انسانی سوچ و جذبات کے حوالے سے سمجھنے کی بجائے ان کے کردار کے معروضی مطالعہ کا آغاز ہوا۔ حیوانی زندگی کی حد تک تو یہ طریقہ مفید ہو سکتا ہے مگر ڈائیک نے ستم یہ کیا کہ اس نے جانوروں پر کی جانے والی تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کو انسانی آموزش پر لاگو کرنے کی کوشش کی۔ ملک محمد موسیٰ اور شازیہ رشید کا کہنا ہے کہ ''تاہم بعد کی تحقیقات سے ڈائیک کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ دراصل انسان اور جانور میں پائے جانے والے فرق

کونظر انداز کرنا درست نہیں۔ انسانی آموزش میں انسانی شعور بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انسان سیکھنے کے عمل میں سوچ بچار، ذہانت اور تخیل کو کام میں لاتا ہے۔ اگرچہ غیر مانوس اور پیچیدہ حالات میں مسائل کے حل کے لئے بعض اوقات انسان بھی سعی وخطا کے طریق کو استعمال کرتے ہیں۔ تاہم وہ اوٹ پٹانگ کی بجائے اپنے تئیں موزوں ترین حرکت سے آغاز کرتے ہیں اور اس عمل میں بھی ارادہ، سوچ بچار اور ذہانت پائی جاتی ہے''۔ کردار پسندوں اور انسانیت پسندوں کے درمیان باہمی اختلافات کا ذکر آگے آئے گا۔

تجزیہ نفسی کی یاسیت پسندی اور کردار کی میکانکی معروضیت پسندی دونوں ہی انسان کو مجبور محض کے طور پر محض ایک مشین کی مانند سمجھتی ہیں۔ جو پیدائشی منفی محرکات کے زیر اثر کام کرتا ہے یا ماحول سے حاصل ہونے والی سزا وجزا کے کنٹرول میں ہے ان حالات میں انسانیت پسند نفسیات کے ماہر کارل راجرز کا رجائیت پسند (Optimistic) نظریہ بڑا مقبول ہوا جس نے فرد کی پیدائشی نیک فطرت، تحقیقِ ذات، انفرادیت اور عزت جیسے تصورات پر زور دے کر انسان کے بارے میں مثبت اور خوش آئند خیالات کو فروغ دیا۔ تاہم بہت سے مفکرین نے راجرز کے نظریات کو موضوعی سوچ اور محض اس کی انسان کو اعلیٰ وارفع دیکھنے کی ذاتی خواہش قرار دے کر تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ مگر ان اعتراضات کے باوجود بہت سے ماہرین اسے ایک اہم نظریہ قرار دیتے ہیں۔ جدید نفسیات کی بنیاد اس نظریے پر رکھتے ہیں۔ کارل راجرز کی طرح ایک مشہور امریکی ماہر نفسیات ابرہام ماسلوم 1970ء بھی انسان کو منفرد اور مثبت حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اس نے انسانی ضروریات کو بھی مثبت قرار دیتے ہوئے ترجیحات کے لحاظ سے انہیں اس طرح ترتیب دیا ہے۔ (1) جسمانی ضروریات، جیسے خوراک، پانی، نیند اور تکلیف وغیرہ سے بچاؤ کی ضروریات۔ (2) تحفظ کی ضرورت، یعنی رہائش کے لئے محفوظ جگہ اور خوراک وغیرہ کی مسلسل فراہمی کی ضرورت۔ (3) احساس ہویت (Sense of Indentity) اپنی شناخت کی نشوونما کے لئے کسی گروہ سے تعلق کی ضرورت وغیرہ۔ (4) عزت نفس، معاشرے میں اہم مقام حاصل کرنے کی خواہش وغیرہ۔ اس کے علاوہ تحقق ذات کی ضرورت بھی شامل ہے۔ پروفیسر ساجدہ زیدی کے مطابق ماسلو کا نظریہ انسانی محرکات کو سمجھنے میں اور دوسرے نظریوں کے مقابلے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اس نے انسانی محرکات کی منفرد حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور انہیں محض دوسرے جانداروں کی ارتقائی شکل نہیں مانا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''محرکات ارتقاء ونمو کے سیاق وسباق میں، میں خود کو ماسلو کے نظریے سے بہت قریب پاتی ہوں میرے نزدیک بھی انسان کی فطرت میں ارتقاء ونمو کے محرکات پائے جاتے ہیں۔ انسان جمادات پر قانع نہیں بلکہ اپنے وجود کی بالیدگی اور ارتقاء کا تمنائی ہے۔ اگر شاعر کی نظر میں ''ہر ذرہ ہے محوخودنمائی''۔۔۔ تو نفسیات دان کی نظر میں کم از کم، ہر فرد ہے محوخودنمائی کی وسعت تو ہونی چاہئے۔ میرے خیال میں وہ تشریح انسانی شخصیت کی نفسیات نہیں ہوسکتی جو انسانی زندگی کی نمو پزیری کے اسرار ورموز نہ دیکھ سکے یا ان سے انکار کرے، اور انسان کو محض ایک برتر جانور سمجھے۔ میں اس بات پر زور دوں گی کہ انسانی محرکات کے نظریے کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں انسانوں کو جانوروں سے مختلف (صرف برتر نہیں) مخلوق سمجھنا پڑے گا۔ نیز انسانی شخصیت کے اسرار سمجھنے کے لئے دوسرے جانداروں کے مطالعے سے مختلف اور ہمہ جہت پیمانے وضع کرنے پڑیں گے جن کا نقطۂ نظر بھی انسانیاتی ہوگا۔ (جاری ہے)

☆.....☆.....☆

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط چہارم

پرویز صاحب کا نظریہء حدیث وسُنّت

احادیث کی پوزیشن :۔ پرویز صاحب ''ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت'' میں احادیث کی پوزیشن کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''حدیث کی تاریخ اور صحیح پوزیشن کے متعلق' میں' مختلف مقامات پر بڑی شرح وبسط سے لکھتا چلا آرہا ہوں۔ (میری تصنیف ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب میں' اس تفصیل کا ملخّص بڑے جامع ومانع انداز سے دیا گیا ہے)۔ یہ حقیقت ہے کہ نبیءاکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے' یا مرتب کرا کر' اپنی تصدیق کے ساتھ اُمت کو نہیں دیا۔ حضور ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد' بعض حضرات نے انفرادی طور پر' ان اقوال کو جمع اور مرتب کیا۔ جنہیں حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اس طرح احادیث کے مختلف مجموعے وجود میں آئے۔ ان مجموعوں میں جو روایات درج ہیں' ان میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ یہ جو ہمارے ہاں مختلف فرقوں میں باہمی اختلافات پائے جاتے ہیں تو ان کی وجہ یہ ہے کہ ایک فرقہ ایک حدیث کو صحیح قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور دوسرا فرقہ اسے غلط (ضعیف اور وضعی) قرار دے کر' اس کے خلاف کسی دوسری روایت پر عمل پیرا ہوتا ہے' لہٰذا جب بات کسی حدیث تک پہنچے گی تو سب سے پہلے یہ سوال سامنے آئے گا کہ آیا وہ حدیث قولِ رسول ﷺ ہے بھی یا نہیں۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں۔'' ان حالات میں آپ سوچئے کہ اگر کسی مسئلہ کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار حدیث کو قرار دیا جائے تو اس مسئلہ تک پہنچنے سے پہلے' فریقین کی پیش کردہ احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث چھڑ جائے گی۔ اور یہ بحث ایسی ہے کہ اس کا فیصلہ ہزار برس سے نہیں ہو پایا۔''

جمع وتدوینِ حدیث :۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ احادیث کے یہ مجموعے مرتّب کس طرح ہوئے تھے تو بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان میں صحیح کے ساتھ ساتھ غیر صحیح روایات کس طرح در آئیں۔ حضور کریم ﷺ کے زمانے میں احادیث کا کوئی مجموعہ تیار نہیں ہوا تھا۔ حضور کریم ﷺ نے فرمادیا تھا کہ کوئی شخص اُن ﷺ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور نہ لکھے اور اگر کسی نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھا ہو تو مٹا ڈالے (مسلم)۔ خلافتِ راشدہؓ میں بھی کوئی مجموعہء احادیث تیار نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہ امر زیرِ بحث آیا کہ مجموعہء احادیث ہونا چاہیئے۔ تقریباً ایک ماہ کے غور وخوض کے بعد حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ پہلی اُمتوں نے جب خدا کی کتاب کے ساتھ اور چیزوں کو شریک کر لیا تو وہ تباہ ہوگئیں۔ (مولانا شبلی نعمانی کے مطابق تو حضرت عمرؓ احادیث روایت کرنے والوں کو

دُرّے لگاتے تھے۔ ''الفاروق'')۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعہء احادیث نہیں ملتا جو خلفائے راشدینؓ نے خود مرتب فرمایا ہو یا اُن کی زیرِ نگرانی مدّون کیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر خلفائے راشدینؓ احادیث کو جزوِ دین سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کی عام نشر و اشاعت کا اہتمام فرمادیا تھا' خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد' خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہ کیا گیا۔

مقامِ حدیث:۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں جمع و تدوینِ حدیث پر مفصّل اور پُر مغز بحث کی گئی ہے کہ۔ ''علمائے حدیث کو بڑی تحقیق و کاوش کے بعد پہلی صدی ہجری کا ایک مجموعہء احادیث ملا ہے جو صحیفہء ہمام ابن منبہؒ کے نام سے متعارف ہے۔ (اس صحیفہ کو چند سال اُدھر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا تھا)۔ امام ہمام ابن منبہؒ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ اس صحیفہ میں کل (۱۳۸) حدیثیں ہیں۔ جن کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ اُنہوں نے اِنہیں اپنے اُستاد (حضرت ابو ہریرہؓ) کے سامنے لکھا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ۵۸ھ سے پہلے کا مرتب شدہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام ہمام ابن منبہؒ ۵۸ھ سے پہلے' مدینہ میں بیٹھ کر احادیث کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں اور اُنہیں صرف (۱۳۸) احادیث ملتی ہیں۔ اور تیسری صدی ہجری میں جب امام بخاریؒ احادیث جمع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُنہیں چھ لاکھ احادیث مل جاتی ہیں۔ (امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ اور امام یحیٰی بن معینؒ کو بارہ لاکھ احادیث ملی تھیں)۔ نیز یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جو احادیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہیں' ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن اُن کے شاگرد کے مجموعہ میں کل (۱۳۸) احادیث ہیں۔ بہر حال! پہلی صدی ہجری میں انفرادی طور پر احادیث جمع کرنے کی جو کوشش ہوئی' اس کا ماحصل صحیفہء امام ہمام ابن منبہؒ کی ایک سو اڑتیس احادیث ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے کسی تحریری سرمایہ کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کے بعد ۱۰۰ھ کے قریب خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کچھ احادیث اپنے طور پر جمع کرائیں۔ اُن کے بعد امام ابن شہاب زہریؒ (المتوفی ۱۲۴ھ) نے خلفائے بنی اُمیہ کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعہء احادیث تیار کیا جس کے متعلق اُن کا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار گزرا (بحوالہ: مختصر جامع بیان العلم)۔ لیکن نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جمع کردہ احادیث کسی مدون صحیفہ کی شکل میں موجود ہیں اور نہ امام زہریؒ کا مذکورہ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے۔ البتہ بعد کی کتبِ احادیث میں اُن کی روایات ملتی ہیں۔'' ۔ ''احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت موجود ہے' امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) کی کتاب موءطا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُس زمانے میں مدینہ میں ارکانِ اسلام کے متعلق صحابہؓ کا عمل کیا تھا۔ اس کے مختلف نُسخوں میں تین سو سے پانچ سو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اور دوسرے ائمہء علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں کئی ایک کتبِ احادیث مدون ہوئیں۔ عہدِ عبّاسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی

ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتبِ احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کر لی۔ کتبِ احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و مسلم) ہیں۔ امام بخاریؒ (المتوفی ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کاٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔ اسی کتاب کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے۔ کتبِ احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں اب ''دین کا جزو'' قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں اہل سنّت والجماعت (سُنّی حضرات) صحیح ترین مانتے ہیں۔ (انہیں صحاح ستہ۔ یعنی حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں) کہا جاتا ہے۔ صحاح ستہ یہ ہیں :۔(۱):۔صحیح بخاری (۲):۔صحیح مسلم (۳):۔ترمذی (۴):۔ابوداؤد (۵):۔ابنِ ماجہ (۶):۔نسائی۔ ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے اور ان دونوں میں سے بخاری کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ'' ''واضح رہے کہ شیعہ حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔ وہ سنیوں کے مجموعوں کو صحیح نہیں مانتے۔ نہ ہی سُنی اُن کے مجموعوں کو قابلِ سند تسلیم کرتے ہیں۔

شیعوں کی احادیث:۔ شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے حسب ذیل ہیں۔

(۱):۔الکافی:۔ جامع ابوجعفر محمد جو کلینی کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی۔

(۲):۔من لایستحضرہ الفقیہ۔ یہ شیخ محمد ابن علی (متوفی ۳۸۱ھ) کی تالیف ہے۔

(۳):۔تہذیب:۔ موءلفہ شیخ ابوجعفر محمد بن حسن۔ متوفی ۴۶۰ھ۔

(۴):۔استبصار:۔ یہ بھی اُنہی کی تالیف ہے۔ (ان میں سے کوئی بھی عرب نہیں ہے)۔

سُنّیوں کی احادیث:۔ سنی حضرات کے مجموعہ ہائے احادیث کے جامعین کا مختصر تعارف حسبِ ذیل ہے:۔

(۱)۔امام بخاریؒ:۔ یہ بخارا میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ (یا بعض کے نزدیک ۲۶۰ھ) میں سمرقند کے قریب فوت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر چھ لاکھ کے قریب احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انہوں نے اپنے معیار کے مطابق صرف قریب (۷۳۰۰) احادیث کو صحیح پایا اور انہیں اپنی کتاب میں درج کر لیا۔ (باقی قریب پانچ لاکھ ترانوے ہزار کو مسترد کر دیا)۔ ان (۷۳۰۰) میں سے بہت سی احادیث مختلف ابواب میں مکرر نقل ہوئی ہیں۔ اگر ان مکررات کو شمار نہ کیا جائے تو باقی (۲۷۶۲ یا ۲۶۳۰) رہ جاتی ہیں۔

(۲)۔امام مسلمؒ:۔ صحیح مسلم کے جامع امام مسلم بن حجاجؒ تھے جو ایران کے مشہور شہر نیشاپور کے باشندے تھے۔ ان کی ولادت ۲۰۴ھ

میں اور وفات ۲۶۱ھ میں ہوئی۔ انہوں نے تین لاکھ احادیث اکٹھی کیں جن میں سے صرف (۴۳۴۸) قبول کیں' باقی کو مسترد کر دیا۔

(۳)۔ ترمذیؒ:۔ امام ابوعیسیٰ محمد ترمذی۔ یہ ایران کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔ سال ولادت ۲۰۹ھ اور وفات ۲۷۹ھ ہے۔ انہوں نے تین لاکھ احادیث جمع کیں جن میں سے صرف (۳۱۱۵) قبول کیں جبکہ باقی کو مسترد کر دیا۔

(۴)۔ ابوداؤدؒ:۔ سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ میں وفات پا گئے۔ انہوں نے پانچ لاکھ احادیث اکٹھی کیں جن میں سے صرف (۴۸۰۰) کو قبول کیا' باقی کو مسترد کر دیا۔

(۵)۔ ابن ماجہؒ:۔ ابوعبداللہ محمد بن زید ابن ماجہ۔ یہ شمالی ایران کے شہر قزوین کے رہنے والے تھے۔ سن پیدائش ۲۰۹ھ اور رحلت کا سن ۲۷۳ھ ہے۔ انہوں نے چار لاکھ میں سے صرف (۴۰۰۰) احادیث کو قبول کیا۔ باقی کو مسترد کر دیا۔

(۶)۔ نسائیؒ:۔ امام عبدالرحمن نسائی مشرقی ایران کے صوبہ خراسان کے ایک گاؤں ''نساء'' میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن وفات ۳۰۳ھ ہے۔ ان کی جمع کردہ احادیث کی تعداد دو لاکھ ہے۔ جن میں سے اُنہوں نے صرف (۴۳۲۱) احادیث کو قبول کیا۔ باقی کو مسترد کر دیا۔ ان ائمہ حدیث کے اس مختصر سے تعارف سے حسب ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:۔

(۱):۔ **یہ سب کے سب ایرانی تھے:**۔ ان میں عرب کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ مقام حیرت ہے کہ عربوں میں سے کسی نے بھی اس عظیم کام کا بیڑہ نہ اٹھایا اور احادیث کی جمع وتدوین کا کام غیر عربوں (عجمیوں) کے ہاتھوں سرانجام پایا۔

(۲):۔ یہ تمام حضرات تیسری صدی ہجری میں ہوئے۔

(۳):۔ اُنہوں نے لاکھوں حدیثیں پائیں لیکن ان میں سے بہت تھوڑی ایسی تھیں جنہیں انہوں نے صحیح قرار دے کر اپنے مجموعوں میں درج کیا۔

(۴):۔ یہ تمام احادیث' لوگوں نے انہیں زبانی سنائیں۔ ان کا کوئی تحریری ریکارڈ اس سے پہلے کا موجود نہیں تھا۔

(۵):۔ ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن کا انتخاب کیا' وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلہ کا نتیجہ تھا۔ ان احادیث کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس خدا کی سند تھی (یعنی خدا نے انہیں بذریعہ وحی نہیں بتایا تھا کہ فلاں حدیث صحیح ہے' اسے رکھ لو اور فلاں غلط ہے' اسے مسترد کر دو)۔ نہ ہی اس کی کوئی سند رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی تھی (کہ تم نے جن احادیث کا انتخاب کیا ہے' وہ فی الحقیقت میرے اقوال ہیں)۔ نہ ہی ان کے پاس پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ تھا' جس سے انہوں نے ان احادیث کا انتخاب کر لیا ہو۔ لوگوں کی زبانی باتیں تھیں' جنہیں انہوں نے اپنی فراست کے مطابق' صحیح تصور کر کے اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا تھا۔

اب آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی انفرادی کوششوں کے نتیجے کے متعلق کسی طرح بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں؟ پھر اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ اس دواڑھائی سو سال کے عرصے میں جو باتیں لوگوں کی زبانی آگے منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں، ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ تھے جو اُسی طرح باپ سے بیٹے یا اُستاد سے شاگرد نے سن کر حفظ کر لئے تھے۔ ان باتوں کو ہر راوی اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا۔'' ''احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں (بخاری اور مسلم سمیت) ان کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے نہیں ہیں۔ یہ احادیث ''**روایات بالمعنیٰ**'' ہیں۔ یعنی ان کا انداز یہ ہے کہ مثلاً ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ سنا۔ اس نے اُس سے جو کچھ سمجھا، اپنے الفاظ میں کسی دوسرے سے بیان کیا، اس نے جو کچھ اخذ کیا اسے آگے منتقل کیا۔ اب ذرا تصور میں لایئے اس صورتِ حالات کو کہ یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال نہیں بلکہ دواڑھائی سو سال تک یونہی جاری رہے اور اس کے بعد لوگوں میں اس طرح پھیلی ہوئی باتوں کو یکجا جمع کیا جائے تو ان باتوں کو، پہلے کہنے والے (یعنی نبی اکرم ﷺ) کے بیان فرمودہ مفہوم سے جس قدر تعلق ہوگا وہ ظاہر ہے۔'' ''یہی وجہ ہے کہ جب آپ قرآنی آیت پڑھتے ہیں تو پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ''قال اللہ تعالیٰ'' یعنی ''اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔'' اور جب کوئی حدیث بیان کرتے ہیں، تو اس کے شروع میں کہتے ہیں۔ ''قال الرسول ﷺ'' (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا)۔ اور آخر میں کہتے ہیں۔ ''او کما قال رسول اللہ ﷺ''۔ (یعنی یوں یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا)۔ اور یہی وجہ ہے کہ احادیث کو اقوالِ رسول اللہ ﷺ نہیں کہا جاتا بلکہ اقوال **منسوب الی الرّسول** کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو احادیث جمع کرنے والوں کے زمانے میں لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے تھے۔''

طلوعِ اسلام:۔ مئی جون ۱۹۸۲ء۔ صفحہ نمبر ۲۷:۔ ''حضور ﷺ کے بعد، صحابہؓ کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا۔ یعنی انہوں نے بھی، نہ یہ کہ احادیثِ نبوی ﷺ کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کرایا بلکہ جس کے پاس کوئی تحریری نوشتہ موجود تھا، اس نے اسے جلا دیا۔ یہ حقیقت ایسی مسلمہ ہے کہ اس کی تائید میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی، ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ نہایت اہم کتاب ''مقامِ حدیث'' میں ملے گی۔ نیز، میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب میں۔۔ اور اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر مجموعہ ہائے احادیث موجود ہیں (جو تیسری صدی میں مرتب ہوئے تھے) ان میں، ان سے پہلے کی کسی کتاب کا نہ حوالہ ملتا ہے نہ اقتباس۔''

حفاظتِ حدیث؟:۔ خداوندِ کریم نے آخری وحی (قرآنِ کریم) کی حفاظت کا ذمہ خود ہی لے لیا اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قرآن کریم چودہ سو سال سے زیادہ عرصے سے غیر متبدل و محفوظ چلا آرہا ہے۔ اگر حدیث کو بھی (قرآن سے بلند یا قرآن کے

برابر) وحی یا وحی کی کوئی قسم تسلیم کرلیا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ اس وحی (حدیث) کی حفاظت کا ذمہ خدا نے کیوں نہ لیا؟۔ احادیث کی عدمِ حفاظت کا ثبوت یہ ہے کہ محدثین اور دیگر علمائے کرام کے درمیان کسی ''دستیاب روایت'' کے یقینی طور پر ''حدیث'' ہونے یا نہ ہونے اور پھر اُس کے ''صحیح حدیث'' ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں آج تک بحثیں جاری ہیں۔ جبکہ قرآن کریم کی کسی بھی آیت کے بارے میں یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ دیگر حیرت انگیز خصوصیاتِ قرآن کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کا ''دائمی طور پر محفوظ'' رہنا ہے۔

آئینی و قانونی حیثیت:۔ سوچنے کا مقام ہے کہ اس طرح جمع و مدوّن کی ہوئی روایات کو وحی (خفی) وحی غیر متلو یا غیر مکتوب وغیرہ) کا درجہ دینا اور انہیں یقینی طور پر دینی، آئینی اور قانونی حیثیت دے کر، غیر مشروط طور پر، اسلامی قانون کا دوسرا بڑا ماخذ قرار دینا کس حد تک درست ہے؟۔ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ اور علامہ اقبالؒ کے نظریاتِ حدیث کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جو اسی مضمون میں قبل ازیں پیش کئے جا چکے ہیں (موءلف)۔

☆.....☆.....☆

علومِ حدیث:۔ حدیث کے صحیح اور غلط ہونے کے معیار کے بارے میں پیچیدہ علوم کی بنیاد رکھی گئی۔ ان میں روایت و درایت اور جرح و تعدیل کے اصول وضع کئے گئے جو قابلِ اعتماد نہ ہونے کے علاوہ ایک عام آدمی کی سمجھ میں آنے والے بھی نہیں۔ انہی اصولوں کے تحت حدیث، اور حدیث کے تحت قرآن کو سمجھنے کا عقیدہ بھی ذہنوں میں راسخ کیا گیا۔ اس طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فہمِ قرآن تک پہنچنا کس قدر مشکل بنا دیا گیا۔ احادیث کی پرکھ کے لئے قرآن کریم کو اعلیٰ معیار ماننے کے سادہ اور یقینی طریقے کی بجائے اسماء الرجال کا علم ایجاد کیا گیا جس کا انحصار انسانوں پر ہے۔

اسماء الرجال:۔ اس علم کی نسبتیں بھی بڑی مقدس ہستیوں کی طرف کی گئیں۔ تاکہ اس کے خلاف کوئی زبان نہ کھول سکے۔ اس علم کے مطابق حضور کریم ﷺ کی وفات کے کئی سو سال بعد یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار راوی کے احوال و کوائف اور کردار پر ہے یعنی کسی حدیث کی پرکھ کا معیار قرآن کی بجائے کسی انسان (راوی) کا کردار قرار پایا۔ کہ اگر راوی معتبر اور قابلِ اعتماد ہے تو حدیث بھی صحیح ملی ہوگی اور اگر راوی کسی وجہ سے غیر معتبر اور نا قابلِ اعتماد ہے تو پھر اس کی روایت کردہ حدیث بھی وضعی، ضعیف یا کمزور (وغیرہ) سمجھی جائے گی۔ اس خود وضع کردہ نظریہء معیارِ حدیث کے تحت خود سے کئی سو سال پہلے گزرے ہوئے، فوت شدہ لوگوں کے ذاتی کردار کی تلاش اور چھان بین شروع ہوگئی۔ یہ بھی عجیب طریقہ تھا۔ صدیوں پہلے گزرے ہوئے کسی شخص کے کردار کے بارے میں معلومات بھی خدا نے نہیں بلکہ انسانوں ہی نے فراہم اور جمع کیں۔ اسماء الرجال کے بارے میں ادارہ طلوعِ اسلام کی قابلِ مطالعہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں بڑی خوبصورت بحث کی گئی ہے کہ۔ ''جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کا یہ وہ فن ہے جس کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس فن کے ائمہ نے بڑی محنت سے کام

لیا۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح آپ کسی طرح بھی یقین کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں؟۔آپ نے جس آدمی سے کوئی بات سُنی ہو اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قابل اعتماد ہے۔لیکن اگر اس بات کے بیان کرنے میں گزشتہ دواڑھائی سو برس میں گزرے ہوئے پانچ سات آدمیوں کا ذکر ہو تو آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کون سا ذریعہ ہوسکتا ہے کہ وہ قابلِ اعتماد تھے یا نہیں۔اور پھر یہاں سوال صرف قابلِ اعتماد ہونے کا ہی نہیں' اس امر کا یقین ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ اتنی صلاحیت رکھتے تھے کہ بات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور سمجھنے کے بعد اس کا صحیح صحیح مفہوم اپنے الفاظ میں آگے منتقل کر دیں۔کہئے! کہ یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ آپ گزشتہ دواڑھائی سو سال میں گزرے ہوئے آدمیوں کے متعلق حتم و یقین کے ساتھ یہ کچھ کہہ سکیں ؟۔ یہ ناممکن ہے۔'' اس کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی مشہور تصنیف ''تفہیمات'' حصہ اول کے صفحات نمبر ۳۱۸ تا ۳۲۲ کے حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔جن میں اسماء الرجال پر بحث کر کے اس علم کو ناقابلِ اعتماد قرار دیا گیا ہے۔

مودودیؒ اور اربابِ جرح وتعدیل:۔طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۱ء۔صفحہ نمبر ۵۳:۔''اربابِ فن نے سوچا کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ جن راویوں نے یہ روایات بیان کی ہیں' وہ قابلِ اعتماد (ثقہ) بھی تھے یا نہیں!۔یہ خیال تو اچھا تھا لیکن آپ سوچئے کہ اُن کے پاس وہ کون سے ذرائع تھے جن کی بناء پر وہ ڈیڑھ' دوسو سال پہلے کے انسانوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم کر سکتے کہ وہ کیسے تھے؟۔ظاہر ہے کہ اس تحقیق میں انہیں جو (Material) میسر آیا' وہ اُسی کی بناء پر' ان راویوں کی ثقاہت یا عدم ثقاہت کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے تھے؟۔یہاں معیار پھر ان کی ''رائے'' قرار پا گئی۔اس باب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کہتے ہیں:۔''جن حضرات نے رجال کی جرح وتعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔بشری کمزوریاں ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو' وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو۔۔اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایہء اعتبار سے ساقط ہوں۔پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور نیک نیتی اور صحتِ ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو مشکل ہے۔'' (تفہیمات۔حصہ اوّل۔صفحہ نمبر ۳۲۱)۔

مودودیؒ اور اسماء الرجال:۔اس کے بعد' بعض اربابِ فن نے اس امر کی تحقیق کی کوشش کی کہ راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے' آیا وہ اس کا ہم عصر بھی تھا' یا نہیں۔ہم عصر تھا تو وہ اس سے ملا بھی تھا یا نہیں۔ملا تھا تو کیا اس نے یہ خاص حدیث اُس سے سنی تھی یا کسی اور سے سن لی تھی۔ان کی تحقیق کے متعلق مودودی مرحوم نے کہا ہے کہ:۔''اسے کلیۃً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبوی ﷺ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔'' (ایضاً۔صفحہ نمبر ۳۲۲)۔اربابِ جرح وتعدیل اور اسماء الرجال نے' راویوں کی ثقاہت کے متعلق جو رائے قائم کی' اس کی رو سے انہوں نے احادیث کے مختلف درجے مقرر کر دیئے۔کسی کو صحیح کہا۔کسی کو حسن۔کسی کو ضعیف وغیرہ۔ان

میں ''صحیح'' کی اصطلاح بڑی مغالطہ آفرین ہے۔ سنیوں کی احادیث کے چھ مجموعوں کو ''صحاح ستہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی صحیح حدیثوں کے چھ مجموعے۔ بخاری اور مسلم کو صحیحین۔ اور بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ۔ ان حدیثوں کو صحیح کہنے سے عام طور پر عام ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقینی طور پر صحیح، یعنی رسول اللہ ﷺ کے مستند ارشادات ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ بات نہیں۔ یہ صرف محدثین کی اصطلاح کے طور پر صحیح کہلاتی ہیں۔ یقینی طور پر ان کے متعلق بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اقوالِ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کو ہر حدیث کے آخر میں یہ لکھا ملے گا۔۔۔ ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ۔'' (یوں، یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو)۔ ''مقامِ حدیث'' میں ''ثقاہت کا فیصلہ'' کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔

ثقاہت (قابلِ اعتماد ہونے) کا فیصلہ:۔ ''عقائد کے اختلاف سے حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے اختلاف کا سب سے بڑا مظاہرہ سُنی اور شیعہ فرقوں کا وجود ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے سُنی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلہء روایت تابعین وصحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیم ان مجموعوں میں جناب نبیء اکرم ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اُس سے بہت ہی مختلف تعلیم احادیث کے اُن مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں۔ ان کا سلسلہء روایت بھی اسی طرح تابعین وصحابہؓ تک پہنچتا ہے۔

شیعہ اسماء الرجال:۔ اب یہ حضرات (کم از کم سُنی حضرات) تو یہ تصور میں بھی نہیں لاسکتے کہ وہ بزرگانِ دین جو اُن احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں داخل ہیں وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ اور معتبر ماننا پڑے گا (کیونکہ شیعہ حضرات کی احادیث کے راویان سُنی حضرات کے علمِ اسماء الرجال کے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترتے ہیں)۔ اب صورتِ معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث اُمت کو ملیں جو سُنی حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ کے ہاں صحیح ہیں۔ اور دونوں آپس میں ٹھہریں متناقض۔ اب کہئے! کہ کون سی تعلیم رسول اللہ ﷺ کی قرار دی جائے اور اسے جزوِ دین سمجھا جائے۔ اور کون سی غلط۔''

شیعہ بمقابلہ سُنّی:۔ شیعہ حضرات ان احادیث کو صحیح مانتے ہیں جو انہیں اپنے ائمہ حضرات سے ملی ہیں۔ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم عن الخطا مانتے ہیں لہٰذا اُن کی یہ دلیل کہ اُن کی احادیث صحت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہیں، کا سُنّی حضرات کے پاس شیعہ حضرات کی احادیث کو صحیح نہ ماننے کا کوئی جواب اور جواز نہیں کیونکہ اگرچہ سُنّی حضرات (دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث وغیرہ) شیعہ حضرات کے ائمہ حضرات (یا اپنے محدثین) کو معصوم نہیں مانتے مگر اُن ائمہ حضرات کو نہایت اعلیٰ کردار کا حامل مانتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ شیعہ حضرات کے ائمہ بلاشبہ سُنّی حضرات کے علمِ اسماء الرجال کے اعلیٰ ترین مقامِ معیار پر فائز ہیں۔ سُنی حضرات کا شیعہ احادیث سے انکار سمجھ سے بالاتر ہے۔ یوں سُنّی حضرات کا یہ عمل غیر منطقی قرار پاتا ہے۔ معیارِ حدیث دونوں فرقوں کا ''قرآن کریم'' نہیں (بلکہ اپنا اپنا علمِ اسماء الرجال ہے)، لہٰذا یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی متعدد احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ اگر قرآن

کریم کو معیارِ حدیث وسُنّت ماننے کی بجائے انسانوں (اسماء الرجال) ہی کو معیار ماننا ہے تو پھر شیعہ احادیث سے سنّی حضرات کے انکار کی کوئی تک نہیں۔

تعدّدِ راویان کا اصول:۔ (Principle of a large number of Narrators)۔احادیث وسنن کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا معیار راویوں کی کثرت کو بھی قرار دیا جاتا ہے۔اصول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی غیر صحیح حدیث کو صحیح ماننے پر اکثریت متفق نہیں ہوسکتی لہٰذا، جس حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے پر ثقہ راویوں کی اکثریت کا اتفاق ہو، اُسے صحیح یا غیر صحیح (جیسی بھی صورتِ حال ہو) تسلیم کرلینا ضروری ہے۔یہ ایک یکسر غیر قرآنی اور غیر سائنسی (Unscientific۔جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو اور جسے ثابت نہ کیا جاسکے) سوچ، اصول اور نظریہ ہے، کیونکہ یہ نظریہ بھی کسی ماورائے انسان معیار (قرآنِ کریم) کی بجائے صرف انسانوں ہی پر انحصار کرتا ہے۔

کثرت وتواتر:۔ اسی طرح تواتر وتسلسل کو بھی حدیث وسنّت کے سلسلے میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ جو حدیث وسنّت لوگوں کی اکثریت کے ذریعے تواتر کے ساتھ اگلی نسلوں تک منتقل ہوئی، وہ صحیح ہوسکتی ہے (حیرت کی بات ہے کہ ہم تک قرآن کریم کے صحیح طور پر پہنچنے کی وجہ بھی ''کثرت وتواتر'' ہی کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ قرآن کریم کثرت وتواتر وغیرہ کا محتاج نہیں)۔کثرت وتواتر ایسی خصوصیات اور ایسے معیارات نہیں جن کی بناء پر کسی تصور، نظریہ یا عمل کو یقینی طور پر صحیح قرار دے دیا جائے۔کثرت وتواتر کا انحصار بھی انسانوں ہی پر ہے، نہ کہ کسی غیر جانبدار اور اعلیٰ ترین Criterion پر۔مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے مختلف نظریات واعمال کو صدیوں سے کثرت و تواتر کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے (مثلاً دیگر بہت سے عقائد واعمال کے ساتھ ساتھ، شیعہ حضرات کی عزاداری وغیرہ اور بریلوی حضرات کے عرس وغیرہ، جنہیں دیوبندی اور اہل حدیث حضرات صحیح تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ مسلمانوں کے ایسے عقائد واعمال کو تواتر سے اکثریت کی تائید حاصل ہے)۔ظاہر ہے کہ تمام فرقوں کے مختلف نظریات واعمال کو باہمی اختلافات کی وجہ سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔اگر کثرت وتواتر کو معیار تسلیم کرلیا جائے تو اس صورتِ حال میں کس کو صحیح اور کس کو غلط کہا جائے گا؟۔ان حالات میں ہٹلر کے وزیر اطلاعات گوئبلز کی تھیوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ''اتنا جھوٹ بولو، اتنا جھوٹ بولو کہ وہ سچ لگنے لگے۔''۔کیا ''کثرت وتواتر'' میں جھوٹ اور غلطی کی تکرار کے امکان کو رد کیا جاسکتا ہے؟۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ طریقے اور انداز، قرآنِ کریم (کو معیارِ حدیث و سنت ماننے) سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں؟۔صرف اُس حدیث وسُنّت کو صحیح کیوں نہ مانا جائے جو قرآنِ کریم سے متصادم نہ ہو۔

قرآن کے بارے میں یہی دلائل:۔ کہا جاتا ہے کہ جس طرح احادیث انسانوں کے ذریعے ہم تک پہنچیں، قرآن بھی تو اسی طرح ہم تک پہنچا۔پھر قرآن کو کیوں قابلِ اعتماد سمجھا جائے اور احادیث کی یہ حیثیت کیوں تسلیم نہ کی جائے؟۔پہلی بات تو یہ ہے کہ

قرآن کریم خود حضور کریم ﷺ نے لکھوا کر اپنی امت کے حوالے کیا۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے (حضور کریم ﷺ اور پھر صحابہ کرامؓ ہر قسم کے فیصلے قرآن کریم کے تحت کرتے رہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس وقت قرآن کریم ترتیب کے ساتھ جمع شدہ صورت میں موجود و محفوظ تھا جس کی مزید نشر و اشاعت کا اہتمام خلفائے راشدینؓ نے کیا جو حیرت انگیز اور معجزانہ طور پر آج تک اُسی صورت میں محفوظ چلا آ رہا ہے)۔ دوسرے، قرآن کریم اپنی شہادت آپ ہے۔ وہ روشنی (نور) ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب علاوہ ازیں، اگرچہ قدرت نے انسانوں کو قرآن کریم کی حفاظت و حقانیت کا ایک ذریعہ ضرور بنایا مگر قرآن کریم انسانوں کا محتاج نہیں۔ مثال کے طور پر اگر زید کے ذریعے بکر کی دکان سے مٹھائی منگائی جائے تو مٹھائی کے مٹھائی ہونے (نہ کہ کوئی اور چیز ہونے) کا ثبوت یہ نہیں کہ اسے زید، بکر کی دکان سے لے آیا ہے، اور زید و بکر دونوں قابلِ اعتماد ہیں بلکہ مٹھائی اپنا ثبوت آپ ہے۔ اسے خود یا تجربہ گاہ میں ٹیسٹ کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہ مٹھائی ہے یا اسی شکل کی کوئی اور چیز۔ قرآن کریم کو بھی (انسانی معاشرے کی تجربہ گاہ میں) ٹیسٹ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی ایک اعلیٰ ترین ہستی کا عطا کردہ خالص، مکمل، غیر متبدل، محفوظ اور بے مثال ضابطہء حیات ہے۔ (موءلف)۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

Metrimonial

We are looking for an educated, family girl, from Quran orientated family, Pakistan or UK, or rest of world for our respectful and obedient 26 year old son, 6 feet 2 inch, very fair, holder of a Pharmacy degree. Education now finished and who lives with family in Birmingham, England, UK.

Also looking for husband for our 27 year old niece, fair, 5 feet 10, Pharmacy degree holder, with above criterion.

Email: jawaidahmed0@yahoo.co.uk

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

تزکیۂ نفس اور زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک بڑا اہم سبب ان کا روحانیت کا غلط تصور ہے۔ جب قرآنِ کریم نے روحِ انسانی کا ذکر تک نہیں کیا، تو روحانیت کا تصور قرآنی کس طرح ہوسکتا ہے۔ ہمارے ہاں مروّجہ عقیدہ یہ ہے کہ روح کو صاف و مصفّٰی و مجلّٰی کرنا ہی انسان کی زندگی کا مقصود ہے اور جس طریقہ سے روح کو مصفّٰی و مزکّٰی کیا جاتا ہے یا جس طریقہ سے روحانیت کے اعلیٰ درجات حاصل کیے جاتے ہیں، اسے ''تزکیۂ نفس'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اور پھر ساری عمر تزکیۂ نفس کرنے میں ہی گزار دی جاتی ہے۔ تزکیہ کا لفظ قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ لیکن قرآن میں اس مادہ سے مختلف صیغوں میں الفاظ آئے ہیں۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ انسانوں کا تزکیۂ نفس بھی فرماتے تھے۔ اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو دکھائی نہ دے سکتی ہو۔ یہ تزکیہ کوئی انفرادی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی چیز ہے اور اس سے مراد انسانی خفتہ صلاحیتوں کی برومندی اور بیداری ہوتا ہے۔ انسانوں نے جو بہترین مملکتیں قائم کی ہیں اور جو Welfare States کہی جاتی ہیں، وہ انسانوں کی دنیاوی ضرورتیں پورا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک فلاحی ریاست کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دستور میں یہ بات مذکور کی جائے کہ وہ ریاست اپنے تمام شہریوں کو رزق فراہم کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ ہر فلاحی ریاست کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کو ملازمت مہیا کرے۔ لیکن ان ریاستوں کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کریں۔ قرآنی فلاحی ریاست کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمارے گھروں میں کام کرنے والے بعض نوجوان لڑکے یا گاؤں دیہات میں کاشت کاری کرنے والے نوجوان انسانی صلاحیتوں کے مالک تو ہوتے ہیں لیکن ان کی یہ صلاحیتیں پوری طور بیدار نہیں ہوتیں، اور اِسی لیے وہ معاشرہ ترقی بھی نہیں کرتا۔

صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا موضوع ایک الگ عنوان ہے کہ انسانی خفتہ صلاحیتیں کس طرح بیدار ہوتی ہیں یہاں مختصراً یہ عرض کرنا کافی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات عالیہ ہیں ان کا Potential ہر انسان کے اندر ہوتا ہے۔ ان صفات کو جلوہ گر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ رزاق ہے، اس لیے ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ دوسروں کو رزق فراہم کرے۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے، ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہر کام میں عدل قائم رکھے۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے، رحیم ہے، ستّار ہے، غفّار ہے، عزیز ہے، حکیم ہے۔ یہ ساری صفات عالیہ انسانوں میں بیدار ہونی چاہئیں۔ اور اسلامی ریاست کی اساس بھی صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ خدا کے ہر حکم کے اندر

خدا کی صفت کا عکس ہوتا ہے۔ اس حکم پر عمل کرتے وقت' اس صفت کو دیکھنا ضروری ہے۔ قرآن کے تمام احکام خدا کی صفات کا مظہر ہیں۔ آپ خود غور فرمائیں کہ جس مملکت اور اس کے شہریوں میں یہ صفات جلوہ گر ہوں گی' وہ معاشرہ کس درجہ جنت نظیر ہوگا' اس کے برخلاف ایک تزکیۂ نفس ہمارے صوفیائے کرام کرتے ہیں جس میں انسان کی کیفیت مانندِ چوبِ خشک اند' نہ قابلِ فروختن' نہ لائقِ سوختن ہوجاتی ہے۔ اِس میں سارا معاشرہ زوال پذیر ہوجاتا ہے اور وہ قوم دوسروں کی دست نگر ہوجاتی ہے۔

اِس مضمون میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ تزکیۂ نفس کا کوئی تعلق روحانیت سے نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ کوئی انفرادی چیز ہے۔ ہم اِس مضمون میں وہ آیات کریمات پیش کریں گے' جو ہمارے نقطۂ نگاہ کی تائید کرتی ہیں۔

پہلے اِس لفظ کے بنیادی معنے ملاحظہ فرمائیں۔ زکو یزکو تزکیۃ' بڑھنا' نشوونما پانا۔ اور زکوٰۃ اسی کا اسم ہے۔ زکی الشیئ کے معنی ہیں کسی چیز کا زیادہ اور بکثرت ہونا۔ زکت الارض اُس وقت بولتے ہیں جب زمین سرسبز ہوجائے۔ ارض زکیہ: سرسبز زمین جس میں خوب نشوونما ہو۔ زکاۃ الیہ کے معنے ہیں اللہ نے اس کو پروان چڑھایا۔ ایڈورڈ ولیم لین نے اپنی مشہور زمانہ Lexicon میں زکاۃ الغلام کے معنے the boy grew لکھا ہے اور زکاعلمہ کے معنے اس کا علم بڑھا ہے۔ المال تنقصہ النفقۃ' والعلم یزکو علی الانفاق کے معنے لکھے ہیں۔

Wealth when one expends it diminishes, but knowledge increases by expending it.

مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے اور علم خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ مشہور درسی لغت' مصباح اللغات میں زکاءٌ کے معنے بڑھنا لکھا ہے۔ زکیٰ کے معنے نشوونما کرنا ہے' اور تزکیہ اسی کا مصدر ہے۔ اب آپ ان تمام معانی پر غور فرمائیں کہ اس کے بنیادی معنے میں کہیں روحانیت کا کوئی تصور تک نہیں پایا جاتا۔ تجدید یادداشت کے طور پر پھر اس بات کا اعادہ کرلیا جائے کہ تزکیہ کے اس بنیادی لغوی معنے کے پیش نظر تزکیہ کا کوئی تعلق روحانیت یا کسی بھی مافوق الفطرت چیز سے ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے ہاں ''تزکیۂ نفس'' تصوف کی ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد روحانی ترقی کرنا ہوتا ہے جو صرف پرستش کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ بالکل غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ قرآنی عقیدہ تو یہ ہے کہ

''خدا کی طرف سے انسان کو ایک خاص جوہر عطا ہوا ہے جسے نفسِ انسانی یا انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ یہ جوہر اپنے اندر عظیم ممکنات رکھتا ہے۔ لیکن یہ انسان کو غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملتا ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما ہوجائے تو موجودہ زندگی میں اِس کا مظاہرہ بلندیٔ سیرت اور پاکیزگی کردار کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور اس سے انسان اِس زندگی سے اگلی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما' اُن مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے جو قرآنِ کریم میں دی گئی ہیں اور ایسا کچھ قرآنی معاشرہ میں ہی ہوسکتا ہے۔ انسانی ذات کے اس طرح نشوونما پاجانے کو تزکیہ کہا جاتا ہے'' (تبویب القرآن)

اب آپ وہ آیات کریمات ملاحظہ فرمائیں جو ہمارے موقف کی تائید کرتی ہیں۔

(1) قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (19:19)۔ (ترجمہ) کہا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رب کا کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا۔ حضرت شیخ الہند نے زکیۃ کا ترجمہ ستھرا کیا ہے اور اس کے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے ایک پاکیزہ' صاف ستھرا' مبارک و مسعود لڑکا جو حسب و نسب اور اخلاق وغیرہ اعتبار سے بالکل پاک وصاف ہوگا۔ لیکن ان تمام باتوں کا کوئی اشارہ قرآن میں نہیں ہے۔ یہ سب خارج از قرآن چیزیں ہیں۔ آیت کا اصل مفہوم جو بالکل قرآن کے مطابق ہے یہی ہے کہ خدا تجھے نہایت عمدہ نشوونما یافتہ بچہ عطا کرے گا۔ اور یہاں روحانیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(2) فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ (18:74)۔ (ترجمہ) پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے تو اس کو مار ڈالا۔ موسیٰؑ بولا کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر عوض کسی جان کے۔ حضرت اقدس نے تزکیہ کا ترجمہ ستھری کیا ہے۔ محترم جناب مولانا مودودی صاحب نے اِس کا ترجمہ بے گناہ کیا ہے۔ تدبرِ قرآن نے اس کا ترجمہ معصوم جان کیا ہے یہ سارے تراجم واقعہ کو سامنے رکھ کے کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی تزکیہ کا ترجمہ نہیں ہے۔ جلالین نے اس کا ترجمہ طاہرۃ' اور اس کے مترجم نے بے گناہ کیا ہے۔ لغوی اعتبار سے یہاں درست ترجمہ پلا پوسہ جوان اور نشوونما یافتہ لڑکا بنتا ہے۔ لیکن دوسری تفاسیر کے بھی جو ترجمے ہم نے دیکھے ہیں ان میں بھی روحانیت کا کوئی مفہوم شامل نہیں ہے۔

(3) فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَىٰ الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ (18:19)۔ (ترجمہ) (اصحاب کہف نے کہا) اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اپنا اس شہر میں پھر دیکھے کونسا کھانا ستھرا ہے' سو لائے تمہارے پاس اس میں سے کھانا۔ یہاں حضرت اقدس نے ازکیٰ کا ترجمہ ستھرا کیا ہے جس میں خود روحانیت کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے مادہ میں نشوونما کا مفہوم ضرور شامل ہونا چاہئے اس لیے اس کا درست ترجمہ Nutritious Food صحت بخش کھانا ہوگا جو جسم کو نشوونما دے۔

(4) فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا (18:81)۔ (ترجمہ) پھر ہم نے چاہا کہ بدلہ دے اُن کو اُن کا رب بہتر اُس سے پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں۔

اِس آیت کی تفسیر میں حواشی عثمانی میں تحریر ہے۔ ''یعنی لڑکے کے مارے جانے سے اُس کے والدین کا ایمان محفوظ ہو گیا اور جو صدمہ ان کو پہنچا حق تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس کی تلافی ایسی اولاد سے کر دے جو اخلاق پاکیزگی میں مقتول لڑکے سے بہتر ہو''۔ حضرت نے غور نہیں فرمایا کہ مقتول لڑکے میں تو کوئی پاکیزگی تھی ہی نہیں اگر اس میں پاکیزگی ہوتی تو وہ ''عبداً من عبادنا'' اُس کو قتل کیوں کرتے۔ یہاں موازنہ پاکیزگی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس آیت کا درست مفہوم یہ ہے کہ ''میں (''عبد'') نے اِس کو قتل کر کے' لوگوں کو اِس کی فساد انگیزیوں سے محفوظ کر دیا۔ اور اس کے ماں باپ کو ناحق لپیٹ میں آجانے سے بچا لیا۔ ان کا پروردگار اُنہیں اس کے بدلہ میں ایک اور لڑکا عطا کر دے گا جو عمدہ صلاحیتوں کا مالک ہوگا' اور لوگوں سے محبت کرے گا۔''

(5) وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (24:21)۔
(ترجمہ) اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت تو نہ سنورتا تم میں سے ایک شخص بھی کبھی۔ لیکن اللہ سنوارتا ہے جس کو چاہے اور وہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ اس آیت میں یُزکی کا ترجمہ سنوارنا کیا ہے، رُوحانیت بڑھانا نہیں کیا۔ اِسی آیت کے حاشیہ میں تحریر ہے ''یعنی شیطان تو سب کو بگاڑ کر چھوڑتا ہے۔ ایک کو بھی سیدھی راہ پر نہیں رہنے دیتا۔ یہ تو خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ وہ اپنے مخلص بندوں کی دستگیری فرما کر بہتیروں کو محفوظ رکھتا ہے اور بعض کو مبتلا ہونے کے بعد توبہ کی توفیق دے کر درست کر دیتا ہے''۔ اگرچہ ''سنوارنا'' اور ''درست کر دینا'' کے مفہوم میں روحانیت شامل نہیں ہوتی۔ لیکن یُزکی کے ترجمہ میں نشوونما کا مفہوم لازماً ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اس تقاضہ کو پورا کرتے ہوئے اس آیت کی تفسیر یہ ہوگی۔

اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (اور وہ تمہیں قرآن جیسا ضابطۂ حیات نہ دے دیتا تو تم میں سے کسی کی بھی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما نہ ہوسکتی۔ اس لئے کہ انسانی نشوونما خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہی ہوسکتی ہے۔ اُس خدا کے قانون کے مطابق جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

(6) چند عائلی قوانین دینے کے بعد ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ (2:232)۔ یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یوم آخر پر اس میں تمہارے لیے بڑی ستھرائی ہے اور بہت پاکیزگی۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)۔ ہمارے ہاں تو ازکیٰ کے معنے بھی پاکیزہ کیے جاتے ہیں اور اطہر کے معنے بہت زیادہ پاکیزہ۔ قرآن کریم یہاں دونوں الفاظ ایک ہی جگہ لے آیا ہے تاکہ دونوں کا فرق واضح ہوسکے۔ ازکیٰ کے معنے نشوونما یافتہ ہیں۔ عائلی قوانین دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ جو اِن قوانین کے مطابق عمل کرے گا اُس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی۔

(7) ارشاد عالی ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (2:129)۔ (حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی کہ) اے ہمارے پروردگار ہماری اولاد میں یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے۔ یہاں تک کہ اُن میں اِس دعوتِ انقلاب کو لے کر وہ رسول اُٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطۂ قوانین کو اُس کی آخری اور مکمل شکل میں اُن کے سامنے پیش کر دے۔ اُنہیں اِس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے اور یہ بھی بتائے کہ اِن قوانین کی غرض وغایت کیا ہے اور اِن پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ اور (صرف نظری طور پر ہی یہ تعلیم نہ دے بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کر دے جس میں) لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور اُن کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ اِس قسم کی نشوونما' قوت وحکمت دونوں کے امتزاج سے ہوسکتی ہے اور اِن دونوں کا امتزاج تیرے متعین کردہ نظام کے اندر ہی ممکن ہے۔

(8) الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92:18)۔ (ترجمہ) جو دیتا ہے اپنا مال دل پاک کرنے کو (حضرت شیخ الہند)۔ یہ آیۂ کریمہ تزکیہ کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ تزکیہ کا کسی طرح بھی روحانیت سے کوئی تعلق نہیں

ہے۔اس آیت کی تشریح میں تدبرِ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے ''یعنی تزکیۂ نفس کے مقصد کے لیے وہ انفاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک وزن رکھتا ہے جو صرف اُس کی خوشنودی اور رضا جوئی کی خاطر کیا جائے۔ یہ غرض نہ ہو کہ کسی کو ممنونِ احسان کر کے اُس سے کسی شکل میں اِس کا بدلہ چاہا جائے''۔ تفسیرِ نمونہ نے اس آیت کا ترجمہ تحریر کیا ہے ''وہی شخص جو اپنے مال کو بخش دیتا ہے تاکہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے''۔ آیۂ کریمہ کے اِس ترجمہ نے بات بالکل واضح کر دی کہ تزکیہ نفس کوئی روحانی چیز نہیں ہے بلکہ جو شخص بھی اپنی دولت دوسروں پر خرچ کرے گا، اُس کا تزکیہ ہو جائے گا۔ مختصر بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اپنی محنت کی کمائی کو ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دینے سے تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے۔ یعنی انسانی جسم کی نشوونما اُس سے ہوتی ہے جسے انسان اپنے اوپر خرچ کرتا ہے' لیکن انسان کے نفس کی نشوونما اُس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں پر صرف کرتا ہے۔

تزکیہ کے ہی بارے میں ایک اہم بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے **وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ** (35:18)۔ (ترجمہ) کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی (اپنے گناہوں کا) بھاری بوجھ والا اپنا بوجھ اٹھانے کے واسطے کسی کو بلائے گا تو اس کے بوجھ میں سے کچھ بھی اُٹھا نہ سکے گا۔ اگرچہ کوئی کسی کا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔ اے رسولؐ تم تو بس اُن ہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے پروردگار کا خوف رکھتے ہیں اور پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور جو شخص پاک صاف رہتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے واسطے پاک رہتا ہے۔ یتزکیٰ لنفسہ۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ اس آیۂ کریمہ نے ''روحانی پیشوائیت'' کی جڑ کاٹ کے رکھ دی ہے۔ اِس آیت سے روحانی پیشوائیت کا تصور ہی بالکل باطل ہو جاتا ہے۔ جس کی ذات کا تزکیہ ہو جاتا ہے اس کا فائدہ صرف اس شخص کو ہی ہوتا ہے' وہ کسی دوسرے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کوئی شخص بھی اپنے تزکیہ سے کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ جو ہمارے ہاں سینکڑوں کی تعداد میں پیر فقیر اور مرید ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ سینکڑوں کی تعداد میں مزاراتِ عالیات ہیں' اور ان میں جو حضرات استراحت فرما رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اِن کی کوئی حیثیت یا مقام نہیں ہے۔ کسی پیر کا (مزعومہ) تزکیہ کسی مرید کے کام نہیں آ سکتا۔ بعض حضرات مریدی اختیار کرنے کو اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اُن کا پیر اُن کے تزکیہ کی طرف رہبری کر دیتا ہے۔ تو یہ راستہ بتانے کے لئے ہی تو قرآنِ کریم کو محفوظ رکھا گیا ہے جس سے ہر شخص خود راہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ باقی رہا تزکیہ کا حصول تو یہ پیر اور مرید کی انفرادی چیز ہے ہی نہیں۔ یہ تزکیہ تو قرآن کے مطابق اجتماعی زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے تزکیہ کے مقابلہ میں تدسیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ **قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا** (91:9-10)۔ (ترجمہ) تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اِس کو سنوار لیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اِس کو خاک میں ملا چھوڑا (حضرت شیخ الہند)۔ دسّٰھا اصل میں دس س کے مادہ سے ہے جس کے معنے کسی چیز کو خاک میں دبا دینے اور مٹی میں ملا دینے کے ہیں' یہی لفظ بدل کے دسّٰھا ہو گیا اور اِس

تبدیلی سے اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ یعنی اُس کو بالکل خاک میں ملا دیا۔ اس تقابل سے تزکیہ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ تصوف میں انسانی ذات کا تدسیہ یعنی نفس کشی مقصود ہوتا ہے۔ قرآنی پروگرام میں مقصود انسانی ذات کی صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول کا کام ایسا نظام قائم کردینا ہوتا ہے جس میں انسانوں کا تزکیہ ازخود ہوتا جاتا ہے' رسول کا فریضہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہر ایک فرد کا تزکیہ خود کرے۔ کیونکہ اس طرح تو رسول کی وفات کے بعد تزکیہ کا سلسلہ ہی ختم ہوجاتا ہے۔ تزکیہ انسان کے خود اپنے اُن اعمال کے ذریعے ہوتا ہے جو اسلامی نظام کے اندر سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ یہ صرف انسان کے اپنے اعمال پر منحصر ہوتا ہے (7:8-9)۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک قوموں کا تعلق ہے وہ اپنے طغیان کی سزا قومی حیثیت سے اِسی دنیا میں پاجاتی ہیں۔ آخرت میں افراد کا محاسبہ اُن کی انفرادی حیثیت میں ہوگا۔ اور ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔

نفوسِ انسانی کے تزکیہ کی اہمیت اور تزکیہ حاصل کرنے کے طریقہ کو بیان کرنے کے بعد قرآنِ کریم تاریخی واقعات کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ فرمایا **كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ ○ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ○ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ○ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۣ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا** (14-11:91)۔ (ترجمہ) قومِ ثمود نے اپنی سرکشی سے (صالحؑ پیغمبر) کو جھٹلایا جب ان میں کا ایک بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا تو خدا کے رسولؑ نے ان سے کہا کہ خدا کی اونٹنی اور اُس کے پانی پینے سے تعرض نہ کرنا۔ مگر اُن لوگوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب سے ان پر عذاب نازل کیا۔ یوں (ہلاک کرکے) برابر کردیا۔

قرآن کریم نے یہ ایک تاریخی شہادت اپنے اِس دعویٰ کی دلیل کے طور پر پیش کی ہے کہ جو قوم طغیان' یعنی اللہ سے سرکشی اور بغاوت میں مبتلا ہوگی۔ پہلے اللہ تعالیٰ اس پر اتمام حجت کرتا ہے۔ پھر اُسے اصلاح کی مہلت دیتا ہے۔ اور اگر وہ قوم اصلاح نہیں کرتی تو پھر وہ اس کو تباہ و برباد کردیتا ہے **كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ** میں ''طغوٰھا'' بہت معنی خیز اور قابل غور لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنے اللہ تعالیٰ سے کھلم کھلا' جان بوجھ کے' اور خوب سوچ سمجھ کر، بغاوت کرنے کے ہیں۔ خاص طور پر اللہ تعالیٰ سے وہ بغاوت جبکہ اُس قوم کے سامنے حق بھی واضح کردیا گیا ہو جس طرح کہ قومِ ثمود کے سامنے حضرت صالحؑ نے حق واضح کردیا تھا۔ اس لفظ کو بیان کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ثمود نے اس رسول کی تکذیب اِس وجہ سے نہیں کی تھی کہ اُن پر حق واضح نہیں تھا۔ بلکہ اُنہوں نے حق واضح ہوجانے کے باوجود محض سرکشی اختیار کرنے کی وجہ سے تکذیب کی تھی۔

قومِ ثمود پر عذاب الٰہی آنے کی ایک وجہ اُس قوم کی اللہ تعالیٰ سے کھلی کھلی بغاوت تھی۔ اور دوسری وجہ قرآن نے ''**بِذَنْۢبِهِمْ**'' میں بیان فرمادی۔ یعنی ''بسبب ان کے گناہوں کے''۔ یعنی یہ عذاب ان پر ان کے اِس جرم کی وجہ سے آیا ہے کہ حضرت صالحؑ کی تنبیہ کے باوجود انہوں نے اونٹنی کو نقصان پہنچایا۔ یہ اونٹنی عذابِ الٰہی کے لیے علامت تھی۔ اُس اونٹنی کو بطور امتحان اِس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ اِس بات کا اندازہ کیا جائے کہ قومِ ثمود کس درجہ نافرمان ہوچکی ہے۔ اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ اگر اب بھی اُس قوم کو مزید ڈھیل دی جاتی ہے تو وہ خود حضرت صالحؑ پر بھی ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے کہ جس کی مہلت اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں دیتا۔ بلکہ جب بھی

کسی قوم نے رسول کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ قوم لازماً تباہ کر دی گئی ہے۔

اکثر مفسرین کرام کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت ہجرتِ نبویؐ سے کچھ ہی عرصہ پیشتر نازل ہوئی تھی جبکہ قریش کے لیڈروں نے حضور ﷺ کو قتل کرنے کی سازش تیار کر لی تھی۔ چونکہ قریش نے یہ مشورے خفیہ کیے تھے اس لیے قرآن نے بھی اعلانیہ کی بجائے اشارات میں اُن پر واضح کر دیا کہ اگر وہ کوئی اس طرح کی سازش بنا رہے ہیں' تو اُس پر عمل درآمد کرنے سے پیشتر دیکھ لیں کہ اس سازش کے بڑے تباہ کن اثرات ہوں گے اور اُنہیں بھی اُن ہی نتائج کا سامنا کرنا ہوگا جو قوم ثمود کو پیش آئے تھے۔

چونکہ تزکیۂ نفس اور زکوٰۃ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے ہم نے اِس مضمون کا عنوان ''تزکیۂ نفس اور زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم'' رکھا تھا لیکن مضمون طویل ہو گیا ہے اس لئے زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم تفصیل سے بیان نہیں کیا جا سکتا' لیکن چونکہ یہ عنوان میں شامل کر دیا گیا تھا اس لئے چند اہم اور مختصر نکات پیشِ خدمتِ عالی کیے جاتے ہیں۔

سورۂ توبہ میں ارشاد عالی ہے **وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ** (9:34)۔ (ترجمہ) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے رسولؐ) ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو مسلمانوں کو یہ حکم بڑا شاق گذرا۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کون کر سکتا ہے کہ اپنے بچوں کے لئے کچھ نہ چھوڑے۔ اِس کا تذکرہ حضرت عمرؓ نے رسولؐ سے کر دیا۔ اِس پر حضورؐ نے فرمایا اللہ نے زکوٰۃ اسی لئے تو فرض کی ہے کہ تمہارا باقی مال پاک ہو جائے۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد باقی مال جمع کرنا ممنوع نہیں ہے اور ایسا مال ناپاک نہیں۔ تفسیرِ مظہری (جلد 5)۔ دیگر تفاسیر میں بھی اس آیت کا شانِ نزول' کچھ حک واضافہ کے بعد یہی تحریر کیا گیا ہے۔ چونکہ تفاسیر میں زکوٰۃ کا تصور اس آیۂ کریمہ سے ماخوذ کیا گیا ہے' اِس لیے ہمارے علماء کرام نے زکوٰۃ کو مال و دولت کے مفہوم تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ زکوٰۃ کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ لفظِ زکوٰۃ کی لغوی تشریح وہی ہے جو تزکیہ کے بارے میں پیشِ خدمت کی جا چکی ہے۔ اِس کے بنیادی معنے ہیں نشوونما' جس کے لیے اجتماعیت اور غلبہ و تمکن کا ہونا ضروری ہے۔ ایتائے زکوٰۃ نہ تو انفرادی چیز ہے اور نہ ہی اِس پر اسلامی نظام کے بغیر عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''بر'' یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کر لو' بلکہ ''بر'' یہ ہے کہ اپنا مال اُس کی محبت کے باوجود اپنے رشتہ داروں' یتیموں' مساکین' وابن سبیل وغیرہ پر خرچ کرو۔ اِس کے بعد آتا ہے وآتی الزکوٰۃ۔ کہ وہ زکوٰۃ دیا کرے۔ اس سے واضح ہے کہ ایتائے زکوٰۃ مال و دولت دینے کے علاوہ بھی کچھ چیز ہے (2:177)۔ پھر حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کو بھی حکم ہوا۔ **وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ** (33:33)۔ (ترجمہ) نماز قائم رکھو' اور زکوٰۃ دیتی رہو' اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتی رہو۔ حالانکہ حضورؐ کے گھر میں کبھی بھی اتنا مال جمع ہی نہیں ہوا جس پر مسلمانوں کے زکوٰۃ کے عام عقیدہ کے مطابق ازواجِ مطہراتؓ پر زکوٰۃ واجب ہوتی۔

یہ اصول ہمیشہ پیشِ نظر رکھئے کہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی صلوٰۃ اور زکوٰۃ اکٹھے آئے ہیں وہاں زکوٰۃ سے مراد مالی زکوٰۃ ہوتی ہے۔

اور جہاں زکوٰۃ کا لفظ تنہا استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں اس سے مراد انسانوں کی جسمانی اور ان کی ذات کی نشوونما کے اسباب فراہم کرنا ہے۔

چنانچہ سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4) امام راغب نے اس کا ترجمہ ''اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں'' کیا ہے۔ یہاں للزّکوٰۃ میں ''ل'' لامِ نافع ہے۔ یعنی یہ فعل کس لئے ہوگا۔ یہ سارا فعل زکوٰۃ کے لیے ہوگا۔ اِس فقرہ کی ترکیب ہم فاعلون للزکوٰۃ بنتی ہے جس سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ہمہ وقت فعلِ زکوٰۃ میں مصروف وسرگرم رہتے ہیں۔ اس مملکت کے تمام افعال زکوٰۃ کے لئے ہوں گے۔ آپ اِس بات کی طرف توجہ فرمائیں کہ دنیا کی ساری حکومتیں لوٹ کھسوٹ (exploitation) میں مصروف ہوتی ہیں' لیکن اسلامی مملکت کا کام دوسروں کی جسمانی نشوونما اور انسانی صلاحیتوں کی آبیاری کرنا ہوتا ہے۔

ہم مسلمانوں کے خلافِ قرآن عقائد نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اور اِس کا بہترین ثبوت ہماری موجودہ حالت ہے۔ مسلمانوں کے اس وقت 56 ممالک ہیں' لیکن سب زوال پذیر ہیں۔ حالانکہ اِن تمام ممالک میں بہترین ذخائر زیرِ زمین موجود ہیں۔ اس کا واحد سبب ہمارے خلافِ قرآن عقائد ہیں۔ چین ہم سے دو سال بعد آزاد ہوا۔ لیکن وہ کس مقام پر ہے اور ہم کس مقام پر۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برلن کو literally بالکل تباہ کر دیا گیا تھا۔ اس کی تمام عمارات جل کے خاک ہوگئی تھیں۔ لیکن چند برس بعد وہ قوم پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم بھی اگر اپنے عقائد قرآن کے مطابق کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسری اقوام سے سبقت حاصل نہ کرلیں۔ اس کے لیے صرف ایک صورت ہے کہ آپ تزکیہ کا موجودہ تصور چھوڑ دیں اور قرآنی تصور اختیار کرلیں۔ تزکیہ کا غیر قرآنی تصور یہ ہے کہ اپنی اور اپنی قوم کی صلاحیتوں کو بالکل ختم کر دیں۔ اس کے برعکس تزکیہ کا قرآنی تصور یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے' اس سے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے۔ اور اسی سے ساری انسانیت کی صلاحیتوں کی آبیاری کی جائے۔ اِس طرح نوعِ انسانی مجموعی طور پر بلند ہوتی چلی جائے گی' اور اِس سے اِس دنیا میں وہ معاشرے قائم ہوں گے جو امن وسکون کا گہوارہ ہوں گے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:97)

وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہ رب العلمین

☆.....☆.....☆

ایک نکتہ

بنجر پاکستان میں باغبانی' جنگل کاری اور آبادکاری کے لئے تمام بے کار افرادی قوت کا صحیح استعمال ہی ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی ہے جو یہ حل کر دے!

(باغبان ایسوسی ایشن)

آصف جلیل

الهداية والعرفان فی تفسير القرآن بالقرآن
محمد ابو زيد الدمنهوری

سورة مريم

(۹۔۱۰) (**قال كذلك**) یعنی جیسا کہ تمہیں بتایا ہے۔ایک لڑکا آئے گا لیکن کیسے آئے گا یہ تمہارے رب کا معاملہ ہے (**الا تكلم الناس**) کیونکہ خاموشی میں غور ہوتا ہے اور تیاری کی جاتی ہے۔**الانبیاء** میں جو قصہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی بیوی کا بانجھ پن ٹھیک ہو گیا۔لڑکا آنے میں اللہ کی نشانی اس کی پیدائش اور میاں بیوی ہونے کے نظام سے متعلق اس کی سنت کے خلاف نہیں ہے۔ دیکھئے **آل عمران**.

(۲۲۔۲۳) بیان کرنے میں اختصار اس بات میں مانع نہیں کہ طبعی طور پر حمل کا مرحلہ آیا تھا۔مقصد یہ کہ مریم کے ساتھ وہی ہوا جو دوسری عورتوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ پیدائش کے وقت کھجور کے درخت کے تنے کے پاس گئیں تا کہ اس کا سہارا لے سکیں۔موت کی خواہش کی تا کہ انہیں دردزہ نہ سہنا پڑے۔ حضرت عیسی اللہ کے بیٹے نہیں تھے وہ اور ان کی والدہ بشریت کی حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔

(۲۴۔۳۰)(**تحمله**) یعنی جس طرح مسافر کو اٹھا کر (یعنی جانور پر سوار کرا کے۔آصف) لے جایا جاتا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لمبے سفر پر تھیں۔دیکھئے **التوبة ۹۲۔الاسراء ۷۰اور البقرة ۲۴۱**۔

(**كان فی المهد صبيا**) یعنی اس دن وہ چھوٹا لڑکا تھا۔کیسے وہ ہمیں حکم دیتا ہے یا کسی بات سے روکتا ہے جبکہ ہم قوم کے بڑے لوگ ہیں۔لہذا یہ حرام کی اولاد ہے۔

(۴۴) بتایا گیا ہے کہ شیطان کی اطاعت کا مطلب اس کی عبادت کرنا ہے۔دیکھئے **الفاتحه** اور جان لیں کہ جو کوئی بھی اللہ کے نظام سے دور ہو اور اس کی مخالفت کی دعوت دے وہ شیطان ہے۔

(۸۱۔۹۸) یہ بتایا ہے کہ لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں یعنی ان سے سفارشیں کراتے ہیں۔جن سے سفارشیں کرائی جاتی ہیں وہ ان سفارش کرانے والوں کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف ہوں گے۔ ہر کوئی اللہ کی طرف اکیلا آئے گا۔اس کے ساتھ کوئی سفارش کرنے والا یا مدد گار نہیں ہوگا۔صرف اس کا عمل ہوگا جو اسے نعمتوں یا جحیم کی طرف لے جائے گا۔

سورة طه

(۴۴) غور کریں کہ اللہ تعالیٰ کیسے اپنے دو رسولوں کو حکم دے رہا ہے کہ وہ فرعون کے ساتھ گفتگو میں نرمی برتیں اور اس سے غصے اور شدت سے مخاطب نہ ہوں۔ اس سے ان لوگوں کے لئے یاددہانی ہے جو رسولوں کے بعد اللہ کی طرف دعوت کا کام کرتے ہیں اور سیدھا راستہ بتاتے ہیں۔ لوگوں کو سختی سے مخاطب کرنے سے وہ آپ سے دور بھاگیں گے اور اس وجہ سے آپ سے عناد رکھیں گے یا کوئی چال چلیں گے۔ دیکھئے النحل ۱۲۵، آل عمران ۱۵۹۔

(۷۷) (اضــــرب) یعنی راستہ اختیار کریں۔ آیت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سارے پانی کے درمیان میں خشک راستے کی طرف راہنمائی کی۔ دیکھئے الاعراف ۱۶۰۔

(۷۸۔۷۹) کیونکہ وہ (فرعون) اس خشک راستے سے بھٹک گیا تھا جس کی طرف حضرت موسیٰؑ کی راہنمائی کی گئی تھی۔ اس سے شیطان کو قائد بنانے میں اور الرحمٰن کو قائد بنانے میں، لوگوں کو ظلم سے بچانے کی کوشش کرنے والوں میں اور لوگوں پر ظلم کرنے اور اذیت دینے والوں میں واضح فرق ہے۔

(۸۲) یہ پابندیاں بتاتی ہیں کہ عمل صالح کے بغیر توبہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ دیکھئے الفرقان کی آخری آیات۔

سورة الانبياء

(۵) اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں (نبی کریم ﷺ کو) کن القاب سے نواز جائے کیونکہ انہیں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔

(۷) اس آیت سے یہ سمجھ لیں کہ لوگوں پر واجب ہے کہ جس بات کا انہیں علم نہ ہو اس کے بارے میں (اھـل الـذکـر) سے رجوع کریں جو اس کے ماہر ہوں اور جن کی مسائل پر گہری نظر ہو۔

(۶۲) (فعـله كبيرهم هذا) طنز کے طور پر کہا تا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں۔ ان مجسموں کو توڑنے کا مقصد آپ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے درمیان البقرة میں ہونے والی بحث سے جان سکتے ہیں جس میں گائے ذبح کرنے کا کہا گیا تھا۔

(۶۹۔۷۱) (کونی بردا وسلاما) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں (آگ) جانے سے بچ جانا۔ دیکھئے المائدة ۶۴ اور النحل ۲۶۔ آپ اس آیت اور باقی قصے میں دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انکی نجات ہجرت کے ذریعے کی اور ان کی تدبیریں الٹ دیں۔

سورة الحج

(۳۸۔۴۱) پڑھئے تا کہ معلوم ہو کہ جنگ دفاع کے لئے تھی اور کیسے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کو تھامتے ہیں اور

اس کی سنت اور کائنات میں اس کے نظام پر چلتے ہیں۔

سورۃ المؤمنون

(۵۰) ان دونوں کو (حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ) ان کی اچھی سیرت کی وجہ سے اور مسیحؑ کو صلیب سے بچا کر نشانی بنایا۔ ان کی والدہ انہیں ساتھ لے کر فرار ہو گئیں اور ہجرت کی؛ جس طرح دوسرے نبیوں نے قتل ہونے سے بچنے کے لئے ہجرت کی۔ (وأويناهم) سے ان کا خوفزدہ ہونا بتایا گیا ہے کیونکہ الایواء (پناہ) صرف خوف کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ اصحاب کہف کا قصہ دوبارہ دیکھئے پھر ھود ۴۳، ۸۰۔ یوسف ۹۶، ۹۹ الضحیٰ ۶ اور الکھف ۶۳ پھر الانفال کا آخری حصہ اور آیت ۲۶۔ (ربوۃ) بلند مقام۔ (ذاتِ قرار ومعین) جہاں زندگی گزارنے کے مواقع ہیں۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں ہے کیونکہ وہاں ان کی یادگاری قبر ہے جس میں مسیحؑ کو دفن کیا گیا۔ لیکن ہم صرف وہی کہتے ہیں جو القرآن میں آیا ہے۔ اور مسیحؑ دوسرے نبیوں کی طرح کیوں نہ ہوں جو وفات پا گئے اور ان کی قبروں کا پتہ نہیں تا کہ لوگوں کے لئے فتنے کا باعث نہ بن سکیں۔ دیکھئے (النساء) ۱۵۷۔۱۵۹ پھر الاسراء دوبارہ دیکھئے۔

سورۃ النور

(۲۔۳) (الزانی والزانیۃ) یہ صفت ان مردوں اور عورتوں پر لاگو ہوتی ہے جو زنا کرتے ہیں اور عادتاً زنا کرنے والے مشہور ہوں۔ وہ کوڑے لگانے کے مستحق ہیں اور ان سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا سوائے اس کے جو انہیں کے طرح کے زانی ہوں یا مشرک جن کے نزدیک عفت اور عصمت کی کوئی قدر نہیں۔ دیکھئے المائدۃ ۳۶ پھر ۵، النساء ۲۵ اور الاسراء ۳۲، اور الفرقان کا آخری حصہ۔

سورۃ الشعراء

(۳۲۔۳۳) دیکھئے کس طرح بحث اور دلیل کی قوت کے لئے مثال دی ہے ۴۵ تک پڑھئے۔

(۴۴۔۴۵) بتایا گیا ہے کہ ان کی دلیلیں مردہ اور بے جان ہیں اور وہ جھوٹ اور فریب سے کام لے رہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی دلیلوں سے ان کے جھوٹ اور فریب کو ظاہر کر دیا۔ دیکھئے یہ قصہ سورۃ الاعراف میں۔

(۵۸) (وکنوز) بتایا گیا ہے کہ مصر میں یہ آثار قدیمہ دفن ہیں جنہیں پرانے مصریوں نے چھوڑا تھا۔ اگر ہماری قوم قرآن کو اچھی طرح پڑھتی تو وہ ان آثار کے بارے میں غیر ملکیوں سے بہت پہلے ہی جان جاتی اور بہت بڑے خزانے کو بچا لیتی۔

(۶۲۔۶۳)(اضرب بعصاک البحر) یعنی اس راستے کو اختیار کر کے چلیں۔ (فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم) یہ سمندر کی حالت کا ذکر ہے۔ اس میں یہ منظر کشی کی گئی ہے کہ کچھ علاقوں کے درمیان خشک راستے ہیں۔ دیکھئے الاعراف ۱۶۰ پھر طٰہٰ ۷۷۔۷۸ تا کہ معلوم ہو کہ کس طرح انہیں خشک راستے کی طرف راہنمائی ملی جس میں سے وہ گزرے تھے۔ الضرب کا استعمال حضرت ایوبؑ کے قصے میں پڑھئے سورۃ ص میں، النساء ۹۴۔۱۰۱، المائدۃ ۱۰۶، الانعام ۵۹، یوسف ۴۳ اور ۴۶ اور جان لیں کہ انبیاء کی مدد کے لئے اللہ کی نشانیاں کائنات اور مخلوقات میں موجود اس کی سنت (طریقہ کار) کے خلاف نہیں ہوتی۔ فاطر کا آخری حصہ پڑھئے۔

(۱۳۷) تدبر کریں کہ کس طرح وہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں اور اپنی رسومات کے تعصب میں کفر کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ہاں دیکھیں تو ہم میں سے اکثریت ایسی ملے گی جو قرآن کریم کی تعلیمات کا انکار اس لئے کرتی ہے کہ وہ اس کے مطابق نہیں ہے جو ہمیں وراثت میں اپنے آباء اور اسلاف سے ملا ہے۔ حتی کہ جنہیں ہم عالم کہتے ہیں اور انہیں شیخ الدین اور شیخ الاسلام کے القاب سے نوازتے ہیں وہ بھی ان مذاہب اور تقالید سے مدد حاصل کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے جو کہ صریحاً القرآن کے خلاف ہوں۔

(۱۵۵) (لھا شرب ولکم شرب یوم معلوم) اس میں باری باری پانی پلانے کا ذکر ہے اور یہ کہ پانی میں دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنا جائز نہیں۔ دیکھئے القمر پھر الاعراف کو دوبارہ دیکھیں تا کہ معلوم ہو کہ ان پر اللہ کا عذاب اس لئے نہیں آیا کہ اونٹنی میں کوئی خاص بات تھی بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اس کے طریقہ کار کو چیلنج کیا تھا اور اس کی مخالفت کرنے سے باز نہ آئے۔ سورۃ ھود میں جو قصہ ہے اس سے آپ دیکھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تین روز بعد عذاب دینے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ اس کے علم میں تھا کہ آتش فشاں پہاڑ پھٹنے والا ہے اور اس کے مطابق اس آتش فشان نے اپنے شور اور زلزلے کی وجہ سے انہیں جا لیا۔ اس کا اپنے دشمنوں کو عذاب اپنے انبیاء کی نصرت کے مترادف ہوتا ہے اور وہ اس کی سنت اور نظام کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ ہر روز ایسی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے جن میں ظالم ہلاک ہوتے ہیں اور اصلاح پسندوں کی مدد ہوتی ہے۔

(۲۱۴۔۲۱۶) ان لوگوں کی امیدوں کا راستہ بند کر دیا ہے جو بغیر کسی عمل کے رسول اللہ کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(۲۲۴) (شعراء) تخیلات میں گم لوگ جو حقائق سے دور ہوں۔ القرآن شاعروں کا قول نہیں کیونکہ وہ ایسے خیالات یا نظریات پیش نہیں کرتا جو قابل عمل نہ ہوں بلکہ ایسے حقائق ہیں جو فی الواقع ہوتے ہیں۔ اور وہ شیاطین سے متفق نہیں ہوتا بلکہ وہ فضیلت اور اصلاح کو قائم رکھتا ہے اور ذلت اور فساد کو ختم کرتا ہے۔ التکویر پڑھئے۔

سورۃ النمل

(۷۔۱۴) (الق عصاک . وادخل یدک فی جیبک) اس کے معنی ہیں کہ انہیں دعوت کے لئے تیار کرو اور انہیں مثال کے

ذریعے دکھایا کہ کیسے دلائل کی قوت اور ثبوت کے ظاہر ہو جانے سے ان کی نصرت ہوتی ہے اور اس کا قول (کأنها جان) بطور مثال سمجھایا ہے۔ طه اور الشعراء میں بیان کردہ قصے میں الجان کی تفسیر سانپ اور اژدھے کی مثال سے کی ہے۔ (فی تسع آیات) سورۃ الاسراء کا آخری حصہ پڑھئے پھر الاعراف کو دہرائیے۔ (سحر مبین) الزاریات ۵۲۔۵۳ تک پڑھئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمام رسولوں کی نشانیوں کو سحر کہا گیا تھا۔ جبکہ ان کی تمام نشانیاں ان کی سیرت اور پیغام کی دلیل اور ثبوت ہوتی تھیں۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی دعوت کے بغیر اپنی صداقت کی دلیل دے سکتے۔ یہ اس لئے تاکہ دعوت اور اس کی دلیل کے مابین تعلق ظاہر ہو۔ اس لئے تدبر کریں۔ (منطق الطیر) جو کوئی بھی پرندہ پالتا ہے اور اسے خود سے مانوس کر لیتا ہے تو وہ اس کی منطق اور ارادہ جان سکتا ہے اور اسے پیغام رسانی کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ (الجن) اس کا اطلاق پوشیدہ دنیا پر بھی ہوتا ہے اور طاقتور ظاہر پر بھی۔ ہر شے کا جن اس کا شروع اور ابتداء ہوتا ہے۔ فوج کے جن اس کے سربراہ اور قائد ہوتے ہیں۔ (الانس) ان کا حکم ماننے والے اور ماتحت۔ سورۃ الجن پڑھئے۔ (والطیر) ہر تیز رفتار کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (نملة) النمل وادی کے قبائل میں سے ایک قبیلہ۔ (الهدهد) پرندے کا نام۔ کیا یہ دو پروں والا ہو سکتا ہے؟ اور اس کے بات کرنے سے مراد وہ خط ہیں جو وہ لے کر آیا؟ یا وہ تیز رفتار گھوڑ سواروں میں سے ہو سکتا ہے یا کسی اور تیز رفتار جانور پر سوار فوجی۔ دیکھئے سورۃ الانبیاء۔ (عرش) ملک۔ (عرشها) اس کی مملکت۔ وہ (حضرت سلیمانؑ) جنگ کرنے کے لئے اور ملک میں داخل ہونے کے لئے منصوبہ سازی اور طریقہ کار طے کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مملکت سبا کا نقشہ طلب کیا تاکہ اس پر حملہ کیا جا سکے اور اسے بتا دیں کہ وہ واقعی عزم رکھتے ہیں مذاق نہیں کر رہے۔ (عفریت من الجن) قائدین میں سے ایک۔ لگتا ہے کہ وہ نہیں سمجھا کہ معاملہ جغرافیائی علم سے تعلق رکھتا ہے اس کے لئے اس کی ضرورت تھی جو علم رکھتا ہو۔ (من الکتاب) جو لکھنا، نقشہ سازی اور منصوبہ بندی کا علم رکھتا ہو۔ (قبل أن یرتد الیک طرفک) اس سے مراد ہے فوری طور پر اور وہ لے بھی آیا۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس نے فوری طور پر اس کی تصویر بنا دی یا اس کے پاس بنی ہوئی موجود تھی۔ اگر وہ فوٹو گرافی کا پرانا زمانہ ہے تو یہ صحیح ہوتا کہ اس کی تصویر اس کے ذریعے بنائی گئی ہوگی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ انکی مملکت میں ہر فن کے ماہر باعمل عالم موجود ہیں۔ اس قصے سے آپ کو یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم کی عظمت بتا رہا ہے اور ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ملک اور مملکت بنانے میں کائناتی اسباب پر عمل کیا جائے۔ (وأوتینا العلم) اس بات کی تائید ہے کہ معاملہ علم سے تعلق رکھتا ہے۔ (مسلمین) اللہ کے احکام کا نفاذ کرنے والے۔ یعنی انہوں نے علم کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کو بھی اپنی تربیت کا حصہ بنایا۔ یہ ملک کے نظام اور اس کی عظمت کی حفاظت کا بہترین طریقہ ہے۔ (الصرح) بلند عمارت۔ دیکھئے القصص ۳۸، غافر ۳۶۔۳۷ (ممرد) ملائم اور چمکایا ہوا (من قوارير) شفاف شیشے کا۔

(۸۲۔۸۵) (تکلمهم) ان کو نقصان پہنچاتی ہے۔ الدابة زمین میں پائے جانے والے جراثیم اور بیماریوں کے وائرس شامل ہیں جو انسانی جسم اور زراعت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ دیکھئے الاعراف ۵۸ اور ۱۵۳۔ (ولم یحیطوا بها علماً) بتایا گیا ہے یہ

نشانیاں مخلوقات کے بارے میں علم کی محتاج ہیں۔ جراثیم کے بارے میں علم ان اہم علوم میں سے ہے جن سے اللہ پر ایمان بڑھتا ہے اور ان سے معاشرتی زندگی کی تجدید ہوتی ہے۔ اور جو اس سے ناواقف ہو وہ اس کا شکار بن جاتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہذا قرآن کا علم پر زور دینے کے بارے میں تدبر کریں۔

(۸۸) بتایا گیا ہے کہ زمین فضا میں دائری حرکت کر رہی ہے۔

سورۃ القصص

(۱۔۵۶) (شیعاً) یہ جابر ظالم بادشاہوں کا طریقہ ہے کہ امت کو فرقوں میں تقسیم کر کے انہیں جماعتیں بنا دیتے ہیں تاکہ وہ ان کے خلاف اکٹھے ہو کر ان کا اقتدار نہ چھین لیں۔ (ام موسیٰ) اس میں قابل غور دلچسپ بات ہے کہ ام موسیٰ کہا گیا ہے مگر ان کے والد کا ذکر نہیں لیکن ان کی قوم نے ان کے باپ کے وجود سے انکار نہیں کیا جس طرح نصاریٰ نے مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا اس بنا پر کہا کہ ان کو ان کی ماں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ سورۃ مریم دوبارہ دیکھیں تاکہ آپ ان میں اور ام موسیٰ کے مابین مماثلت دیکھیں کہ دونوں نے عظیم شخصیتوں کو جنم دیا۔ ان کی اچھی تربیت اور ان کی حفاظت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ (وأن ألق عصاک . اسلک یدک فی جیبک) اس تمثیلی واقعے سے آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دعوت کے لیے تیار کیا اور انہیں بتایا کہ کس طرح دلیل و برہان سے اپنے مخالف پر غالب آنا ہے۔ دیکھئے النحل اور الشعراء جان لیں کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا اور ید کے بارے میں قصہ حضرت عیسیٰؑ کے مردوں کو زندہ کرنے اور مریضوں کو شفا دینے کا، دونوں میں معانی کے لحاظ سے لوگوں کو مشابہت نظر آتی ہے۔ دیکھئے اس تفسیر کا پیش لفظ تاکہ آپ کو رسولوں کا کام سمجھ میں آئے اور یہ کہ ان کی دعوت کی صداقت کے لئے ان کی نشانیاں ان کی سیرت حسنہ اور پیغام کی صلاحیت سے خارج نہیں ہوتیں اور وہ کوئی غیر عقلی شے پیش نہیں کرتے جو اللہ کی سنت اور کائنات میں اس کے نظام کو بدل دے۔ پڑھئے الاسراء ۷۷ تک اور ۳۹ پھر یونس ۱۶ تک اور العنکبوت ۵۱ تک۔

(فی الیم) سمندر یا دریا میں۔ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ اس کا امکان ہے کہ وہ دریائے نیل کا پانی ہو یا چھوٹے سمندروں یا خلیج کا پانی۔ غرض یہ ہے کہ وہ پانی ہے جس میں فرعون اور اس کے فوجی غرق ہوئے کیونکہ وہ اس خشک راستے سے بھٹک گئے تھے جس سے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم گزری تھی۔

(ماکنت) دیکھئے سورۃ یوسف کا آخری حصہ اور آل عمران اور ھود کے شروع میں تاکہ معلوم ہو کہ رسول ان خبروں کو نہیں جانتے تھے اگر اللہ نے انہیں وحی کے ذریعے نہ بتایا ہوتا۔ اور جسے ہدایت چاہئے اور وہ قرآن پڑھتا ہے تو پھر اسے اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(سورۃ القصص ختم ہوئی۔ جاری ہے)

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر مہاتیر محمد

یہودی۔۔۔خدا کی ''خاص'' مخلوق؟

1- یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کے ''خاص'' لوگ ہیں۔ باوجود اس کے کہ انہیں یورپی مسیحیوں کی جانب سے اذیتیں دی گئیں جو ان پر حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھانے کا الزام لگاتے تھے' انہیں یورپ میں الگ تھلگ آبادیوں میں رہنے پر مجبور کیا گیا' انہیں یورپ میں کئی بار قتلِ عام کا سامنا کرنا پڑا' ان سارے واقعات کے باوجود یہودی اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ انسانوں میں بالاتر اور خدا کے خاص چنے ہوئے لوگ ہیں۔

2- یہودی سامی نسل کے لوگ ہیں' اور عرب بھی وہی ہیں۔ لیکن آج یہودیوں کا رویہ ایسا ہے جیسے صرف وہی سامی النسل ہیں۔ یہودیوں کو ان کے غلط کاموں پر جو بھی ٹوکتا ہے یا ان پر تنقید کرتا ہے' یہ لوگ اس پر سامی مخالف ہونے کا الزام لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ جو بھی کریں' چاہے جرم ہی کیوں نہ ہو' یہ تنقید کرنے والوں کو یہودیوں کا دشمن ہی قرار دیں گے۔

3- اس آزاد دنیا میں ہم کسی پر کوئی بھی الزام عائد کر سکتے ہیں اور اسے برداشت بھی کیا جاتا ہے کیونکہ یہ آزادئ اظہارِ رائے کا حصہ ہے۔ لیکن یہودیوں پر کسی قسم کی بھی تنقید کر کے آپ ''یہود دشمن'' کا لیبل لگوائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت سے یورپی ملک اس نظریے کی اس حد تک پاسداری کرتے ہیں کہ کسی کو بھی یہود مخالف ہونے کے الزام میں جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

4- صاف ظاہر ہے کہ یہودی خود کو ایک ایسی خاص مخلوق سمجھتے ہیں جنہیں مذمت یا تنقید سے بھی بالاتر ہونے کا استحقاق حاصل ہے۔

5- ان کا حالیہ رویہ اس تکبر اور غرور کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں چاہے عالمی برادری ان کی کرتوتوں کو مجرمانہ اور یہاں تک کہ غیر انسانی ہی کیوں نہ سمجھتی ہو۔ اس وقت وہ غزہ میں سینکڑوں فلسطینیوں کو شہید کرنے اور ان کی آبادیوں کو تباہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ہسپتالوں' سکولوں اور گھروں پر بم اور میزائل برسائے جا رہے ہیں۔

6- دنیا چاہے اس غیر انسانی عمل کی مذمت کرتی رہے لیکن یہودیوں کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ فلسطینی عوام کے مزید قتلِ عام اور غزہ کی پٹی کو تباہ کرنے کے عزم کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

7- جب یورپ والے ارضِ فلسطین پر اسرائیلی ریاست قائم کرنے لگے تو انہوں نے واضح کیا تھا کہ نئی ریاست میں عرب باشندوں کے حقوق کا احترام کیا جائے گا۔

8- یہودیوں نے اس اعلان کو یکسر نظر انداز کیا اور اسرائیل میں واقع عربوں کی تمام زمین اور جائیدادیں ضبط کر لیں اور انہیں ان

کے گھروں اور کھیتوں تک سے بے دخل کر دیا۔ یہودیوں نے یہ اقدامات عربوں پر سفاکانہ حملوں اور ان کے قتل عام کے ذریعے انجام دیئے۔ مثال کے طور پر دیر یاسین کے علاقے میں فلسطینی عربوں کو زبردستی زمین چھوڑنے پر مجبور کیا گیا لیکن اسرائیلیوں نے دعویٰ کیا کہ عرب اپنی مرضی سے علاقہ چھوڑ گئے ہیں۔

9- 60 سال سے زائد عرصہ گزر چکا' اپنی زمینوں سے بے دخل کئے جانے والے عرب اب بھی پناہ گزین کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ انہیں ضبط کی گئی جائیدادوں کے بدلے میں کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ انہیں یہودی ریاست میں واپس جانے اور وہاں رہنے کی بھی اجازت نہیں۔ یہودیوں کی جانب سے نسل پرستی کی یہ بدترین شکل ہے۔

10- یہودیوں نے فلسطینیوں سے ہتھیائی گئی اس زمین پر اکتفا نہیں کیا جسے اقوام متحدہ نے اسرائیلی ریاست قرار دیا' انہوں نے اسرائیل سے باہر بھی فلسطینیوں کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اس مقبوضہ زمین پر قلعہ بند یہودی بستیاں تعمیر کیں جو صرف اور صرف ان کے اپنے لوگوں کے لئے مخصوص ہیں' یہ انکا ایک اور ''کارنامہ'' ہے جس کی اقوام عالم کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

11- انہوں نے فلسطینی زمینوں پر سڑکیں بنائیں جنہیں فلسطینیوں کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ انہوں نے فلسطینی دیہات کے بیچوں بیچ اونچی دیواریں کھڑی کر دیں اور فلسطینیوں کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ وہ دیوار کے دوسری طرف رہنے والے اپنے دوستوں' رشتہ داروں سے نہیں مل سکتے۔ فلسطینیوں کو فلسطینی قوم کہلانے کی بھی اجازت نہیں' وہ صرف فلسطین اتھارٹی کہلا سکتے ہیں۔ دوسری جانب یورپی ممالک اس حد سے بڑھے ہوئے اسرائیلی تکبر اور ظلم کی توثیق کرتے ہیں۔

12- انہوں نے غزہ کی پٹی کا محاصرہ کر رکھا ہے تاکہ اسرائیلی فوج کی بمباری کے بعد غزہ کے مظلوموں تک خوراک' دوائیں اور دیگر امدادی سامان بھی نہ پہنچایا جا سکے۔ جو جہاز اہل غزہ کو ان کی ضرورت کا سامان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں انہیں اسرائیلی فوج بین الاقوامی پانیوں میں ہی تحویل میں لے لیتی ہے اور انہیں اسرائیل لے جایا جاتا ہے جہاں ان پر لدا ہوا سارا سامان ضبط کر لیا جاتا ہے۔ اسرائیلی پانیوں سے باہر بھی ان جہازوں پر اسرائیلی بحریہ کے حملے معمول بن چکے ہیں جن میں امدادی کارکنوں کو گولیاں ماری جاتی ہیں اور انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔

13- اسرائیل کے پاس 10 ہزار سے زائد فلسطینی ہر وقت زیر حراست رہتے ہیں جن پر کسی بھی وقت اسرائیل مخالف سرگرمیوں کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ ان پر فرد جرم عائد ہوتی ہے نہ ان کا ٹرائل ہوتا ہے' جبکہ حراست کی مدت کا بھی کوئی تعین نہیں کیا جاتا۔

14- یہ اس لئے کہ اگر فلسطینی کبھی کوئی اسرائیلی فوجی یرغمال بنالیں تو اسرائیل اپنے فوجی کے بدلے ان میں سے چند سو قیدیوں کو رہا کر دے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر تیزی کے ساتھ نئے فلسطینیوں کی گرفتاریاں شروع ہو جاتی ہیں تاکہ اپنے ممکنہ یرغمالی فوجیوں کے ساتھ فلسطینی قیدیوں کا تبادلہ کیا جا سکے۔

15- اگر شدید جھنجھلاہٹ میں فلسطینی ان اسرائیلی مظالم کے ردعمل میں خودکش بمبار بھیجیں یا راکٹ فائر کر دیں تو انہیں اس کی

بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ وہ اپنی فوجیں بھیج کر فلسطینی دیہات تباہ اور مرد، خواتین، بچوں، بوڑھوں اور مریضوں سمیت سینکڑوں بے گناہ فلسطینیوں کا قتل عام کر دیں گے۔

16- حالیہ واقعہ جس میں نامعلوم افراد نے تین اسرائیلی طلبہ کو قتل کر دیا، اسرائیل نے غزہ کو فضائی اور زمینی حملوں کا نشانہ بنایا۔ ہسپتالوں، سکولوں اور گھروں کو ظالمانہ طریقے سے تباہ کر دیا گیا۔ ایک ہزار سے زائد فلسطینی شہید اور ہزاروں زخمی ہیں۔ وہ ہسپتال جہاں زخمیوں کو لے جایا جاتا ہے اسرائیلی فوج ان پر بھی میزائل برسا دیتی ہے یہ سوچے بغیر کہ مریض تو ہسپتالوں سے باہر بھی نہیں نکل سکتے۔

17- ان حالات میں عالمی برادری کا پیغام یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اسرائیل اور اسرائیلی دونوں ''مقدس'' ہیں اور جو بھی ان کو ہاتھ لگاتا ہے اسے اس کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی، اس تکلیف سے کئی سو گنا زیادہ جو اس نے اسرائیلیوں کو پہنچائی۔

18- یہ تمام اقدامات جو اسرائیلی کر رہے ہیں، یہ عالمی قوانین، اخلاقیات اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہیں۔ یہ لوگ مہذب دنیا کے ہر قانون کی نظر میں مجرم ہیں۔

19- لیکن اسرائیلی یہودیوں کو اس بات سے استثنیٰ حاصل ہے۔ تمام یورپ اور امریکہ ان کے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ خدا کے ''خاص'' بندے ہیں اور کسی بھی قانون، کسی بھی اخلاقی ضابطے اور کسی بھی انسانی اقدار کی پاسداری سے بری الذمہ ہیں۔

20- جب یہودیوں کو جرمنی میں نازیوں کے ہاتھوں قتل کیا جا رہا تھا تو وہ عالمی ہمدردیاں اور مدد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان کو پہنچنے والی صعوبتوں نے انہیں کچھ بھی نہیں سکھایا، وہ صعوبت کا درد سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ انہوں نے اس وقت نازیوں سے بھی برا رویہ اختیار کر رکھا ہے اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ دوسروں کو کیا اذیتیں دے رہے ہیں اور کس طرح ان میں موت بانٹ رہے ہیں۔

21- یورپ اور امریکہ والوں نے اس عفریت کو جنم دیا لیکن انہیں بھی اس کے جرائم اور مظالم کی کوئی پروا نہیں۔ وہ اسرائیل کی حمایت جاری رکھیں گے چاہے اسرائیل نسل کشی کا مرتکب ہو اور تمام عربوں کو قتل کر دے۔ یہ ان کا ماضی میں یہودیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر کفارہ ادا کرنے کا ایک اظہار ہے۔

حقیقت میں تو یہودیوں کو اپنے اوپر مظالم کا بدلہ جرمنوں اور دیگر یورپی اقوام سے لینا چاہئے تھا۔ لیکن وہ بہت چالاک ہیں۔ ان کے لئے عربوں کو مارنا زیادہ آسان ہے اور مزیدار بھی۔

(مضمون نگار 1981 سے 2003ء تک مسلسل 22 سال تک ملائیشیا کے وزیراعظم رہ چکے ہیں)

(بشکریہ روزنامہ دُنیا لاہور، 28 جولائی 2014ء)

☆.....☆.....☆

مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق
ذاتی مشیر، منفرد مفکرِ قرآن و بانی تحریک طلوعِ اسلام اور تحریکِ پاکستان گولڈ میڈلسٹ

علامہ غلام احمد پرویز کی تصنیفات 2013

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد	نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)	*	1500	مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	150	300
(تین جلدوں میں ـــــ فی جلد)	*	500	انسان نے کیا سوچا؟	300	600
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)	*	1600	اِسلام کیا ہے؟	200	400
(چار جلدوں میں ـــــ فی جلد)	*	400	کتاب التقدیر	300	600
تبویب القرآن (مجلّد)	*	*	جہانِ فردا (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)	200	400
تبویب القرآن (تین جلد میں)	*	*	شاہکارِ رسالت (سیرتِ فاروقِ اعظمؓ)	350	*
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ ـــــ سورہ فاتحہ تا سورہ الحجر)	1900	3800	نظامِ ربوبیت (قرآن کا معاشی نظام)	300	600
مطالب الفرقان (جلد اول)	250	500	تصوف کی حقیقت	300	600
مطالب الفرقان (جلد دوم)	250	500	قرآنی قوانین	150	300
مطالب الفرقان (جلد سوم)	300	600	سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	200	400
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	300	600	سلیم کے نام خطوط (جلد دوم)	200	400
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	300	*	سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)	250	500
مطالب الفرقان (جلد ششم)	300	600	طاہرہ کے نام خطوط	200	400
مطالب الفرقان (جلد ہفتم)	200	400	ختمِ نبوت اور تحریکِ ''احمدیت''	150	300
من و یزداں (اللہ کا صحیح تصور)	250	500	حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظمؒ)	*	100
اِبلیس و آدم	250	500	اقبالؒ اور قرآن (اول۔دوم)	300	600
جُوئے نور	250	500	مجلس اقبالؒ۔اول (شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی)	300	600
برقِ طور (داستانِ حضرت موسیٰؑ)	250	500	مجلس اقبالؒ۔دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد...)	*	200
شعلۂ مستور (حضرت عیسیٰؑ کی داستان)	250	500	قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان (مجموعۂ مقالات و خطبات)	200	400
معراجِ انسانیت (سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ)	300	600	بہارِ نو (مجموعۂ مقالات و خطبات)	200	400

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
ISLAM: A Challenge to Religion	300	600
Exposition of the Holy Quran	*	2000
The Book Of Destiny	300	600
Reasons for Decline of Muslims	*	300
Islamic Way of Living	100	200
Letters to Tahira	*	500
Quranic Laws	*	400
The Quranic System of Sustenance	*	600
Did Quaid-e-Azam Want to Make Pakistan a Secular State?	*	100
اسلامی معاشرت (روزمرہ کے متعلق قرآنی احکام وہدایات)	100	200
اسبابِ زوالِ امت	100	200
جہاد (جہاد کے متعلق قرآنِ کریم کے احکامات)	*	150
خدااور سرمایہ دار (مجموعہ مقالات وخطبات)	*	400
سلسبیل (مجموعہ مقالات وخطبات)	200	400

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
فردوسِ گم گشتہ (مجموعہ مقالات وخطبات)	200	400
متفرق کتب		
مقامِ حدیث	200	400
قرآنی فیصلے (جلد اول)	300	600
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	300	600
قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	*	150
مزاج شناسِ رسول	150	300
تحریکِ پاکستان کے گم گشتہ حقائق	300	*
The Best Of A.S.K. Joommal	*	600
The Pakistan Idea	*	200
Woman - Recreated	*	200
The Bible - Word of God or Word of Man	*	300
The Holy Quran and our Daily Life	*	300

کتابیں ملنے کا پتہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
25 بی، گلبرگ 2، لاہور
فون نمبر: 35753666
trust@toluislam.com
www.toluislam.com

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 01720041073503، حبیب بینک لمیٹڈ، مین مارکیٹ گلبرگ برانچ، لاہور۔

ان قیمتوں میں ڈاک خرچ اور پیکنگ کا خرچہ شامل نہیں۔ یہ قیمتیں کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتی ہیں۔

Surah *Al-Mursalaat* (المرسلات) – Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 28

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is April 27, 1984 and today's lecture starts with Surah *Al-Mursalaat* (المرسلات). This is the last Surah of the 29th part (جز 29) of the Quran.

The struggle between truth (حق *Haq*) and falsehood (باطل *Baatil*) ... and the importance of the last part of the Quran

Last Friday (April 20, 1984) was a special lecture and we did not have our regular lecture. So, let me summarize the lecture of April 13 in order to refresh your memory. As I have been repeating all along the continued struggle between truth (حق) and falsehood (باطل) spread over a long period was reaching its final phase, which the Quran has put it succinctly and cogently in its last two parts (جز). Many of the verses comprising of just two words – especially in the last part – contain deep realities of life as well as historical facts.

The Quran mentions that there are many facets of this struggle but it can be put in two major categories of what it calls: 1) the truth (حق); and 2) the falsehood (باطل). The Quran says: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (9:33) – In this overall struggle the truth (حق) steadily keeps overpowering the falsehood (باطل) until it completely overpowers and dominates it. This is bound to happen according to verse (9:33). The Quran also calls this truth as الدین or Islam.

Two ways the truth (حق) dominates

My dear friends! In this process one way is that a group stands for the truth (حق) and takes on the falsehood (باطل) head on. This way the truth (حق) overpowers the falsehood (باطل) in a short time. Its speed goes up very fast and it advances through history in human timescale. But if this is not the case – if there is no group standing for it – then it does not mean that the truth (حق) runs away from the battlefield and waits until a group takes it up and moves it and tries to impose it on the falsehood (باطل). This is not the case. Actually, the truth (حق) is always there facing the falsehood (باطل). If a human group does not stand for it then it moves with its own

cosmic speed which in human timescale is very slow. But, nonetheless, it overpowers the falsehood (باطل) on its own at its own speed.

Universal cosmic forces produce result in hundreds of years

My dear friends, this second way of dominance of the truth is through the forces of nature, or which, in common parlance is called the demand of the times. This way also the falsehood gets overpowered by the truth but it takes long time. The Quran says that this happens according to Allah's calendar, in which one day of Allah could be as long as one thousand years or even fifty thousand years in human time scale. When the cosmic forces do this job without human help then each phase in this battle takes very long time. If we study world history from this point of view, and observe this fight of the truth with the forces of evil – as mentioned in the Quran – then we find that strange invisible forces come into play at various moments, which shape history in favor of the truth in this incessant struggle. This is an interesting subject of research. It is also difficult and time consuming work and one has to dig deep into history. Otherwise, what we call history is nothing but narration of past events which is not history according to the Quran. The Quran calls the record of continuing struggle between the truth and falsehood and the triumph of the truth over the forces of evil as the real history which provides lessons for future. I will digress from my topic if I come to Hegel and Marx who have stressed the extreme importance of history in the life of human civilizations. Hegel has talked about philosophy of history although people generally talk about history of philosophy. It is Hegel who wrote the book *Philosophy of History*. As I mentioned this is a topic for some other time.

The evidence of history in this struggle between truth and falsehood

My dear friends! Historical evidence supports the Quran's claim: the truth overtakes falsehood at its own cosmic pace – according to Allah's timescale– although, in human timescale, its speed is very slow. Let us take a concrete example. One may be surprised that this is neither related to religion, nor to Din (دین), nor Islam. This is in relation to purely a physical thing but the Quran calls this a truth: سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (31:20) – Allah has made the forces of nature such that human beings can conquer them. There is nothing in the heavens and in the Earth that

humans cannot conquer. Therefore, this is *the* truth: Humans should conquer these forces. And the falsehood is that humans become subordinate or subservient to them.

Now, look at human history. Leave aside major cosmic forces. The primitive humans were afraid of even trivial forces and used to pray and bow down to them, e.g., thunder, rain, lightning, rivers, mountains, sun and moon, etc. Primitive man used to call them gods and goddesses and used to prostate before them; and used to offer sacrifices. Humans started from here. But human history tells us that humans started overpowering them one by one so much so that now man has landed on the moon.

The first aspect of the truth and its opposition from religion

My dear friends, the first aspect of the truth is that the cosmic forces must be conquered. The Quran says that this is the truth (حق). For this truth to come out who knows how many millennia it took and how many pages of history were spent. The entire human history bears testimony to this fact that whenever a scientist uncovered a truth related to this aspect – whether it was that the Earth is round not flat; or that the Earth is moving not stationary etc. – religion always opposed it. Religion declared: hang him who says this. Do you see the history of the struggle between truth (حق) and falsehood (باطل)? But despite this opposition the truth (حق) kept on moving forward by overtaking falsehood.

Religion has always opposed the truth (حق)

You already know that when the American astronauts landed on the moon then our religious establishment made fun of it. Religious sermons were delivered, here in Lahore, which declared anyone who believed in it as unbeliever (کافر). Do you see, wherefrom this opposition is coming against the truth (حق)? This is a case of struggle between truth (حق) and falsehood (باطل). In other words, this is a struggle between Din (دین) and religion (مذہب) that continues forever. Support of falsehood (باطل) is religion (مذہب). Support of the truth (حق) is Din (دین) that overpowers all other systems of life: سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (31:20) – Allah has made the forces of nature such that you can conquer them all.

The second aspect Din (دین) is to complete the truth

My dear friends, this aspect of Din (دین) – to conquer the forces of nature – might be new to some, but in my 50 years of giving these lectures I have always emphasized

that conquering the forces of nature is also part of the Din (دین); it is the first aspect of the truth (حق); albeit it requires the second part of the Din (دین) in order to complete it. That second aspect is: to spend the benefits (obtained from conquering the forces of nature) to humanity at large – since the benefits were obtained from the Universe, so it must be spent universally. But, humans do not listen to this because of their self-interests. So, this struggle between truth (حق) and falsehood (باطل) continues.

The result of this struggle during the Prophet's time

This struggle lasted 23 years between the Prophet (PBUH) and his opponents; and, at every fight, at every confrontation, the truth continued dominating, until, it overpowered its opponent completely – and, finally, the system of Din (دین) was established at the hands of the Prophet (PBUH) and his companions. As a matter of fact, this system of Din (دین) was established so thoroughly that all the religions of the time on all sides that opposed the Prophet (PBUH) were completely overtaken. It was not the case that a new religion took the place of the old religions whether of Iran, or of Rome, or of Egypt, or of any other religion prevailing in Arabia at the time. This was not the case at all. If that was the case then one system of falsehood would have replaced another system of falsehoods. The fact is that the truth, i.e., the system of Din (دین) took over the place of religion (مذہب). This is what happened at the hands of the Prophet (PBUH) and his companions, and which continued until the rightly-guided (الراشدون) Caliphs.

The Quran has called the forces of nature ملائکہ (*Malaaika*)

My dear friends, the Quran describes this confrontation in these last parts in a succinct manner. The words that the Quran has used for these forces of truth that overpower the falsehood could be called the forces of nature, or ملائکہ, or demand of the times. Or they could be called historical necessities in the words of Hegel and Marx – although their interpretation is different than the Quran's. As I told I am not going to get into details about their line of thinking on this issue but these Westerns thinkers do accept that demands of times also produce radical change. In the words of the Quran, human confrontation as well as the demands of times, both are involved in the struggle between truth (حق) and falsehood (باطل). The Quran says: وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (77:1).

My dear friends, this 'و' that comes in the Quran is translated in our translations as "swear by something" so much so that some verses such as – (95:1-2) وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ; وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ – are translated as: "By the fig and the olive; By Mount Sinai". In Arabic language this 'و' actually means that: what follows next provides witness of the principle that is being enunciated here; that the reality that is being described provides the witness for that principle. Here, in this verse (77:1), the principle that is being mentioned is: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (77:7) – the witness is being provided here for the claim that their system based on falsehood (باطل) is bound to be overcome; that it will be overpowered. This is a given fact, and that this verse: وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (77:1) provides the witness for it. These are مُرْسَلٰتِ – that is, these forces are sent by Allah – whether they are messengers; or whether they are groups that stand for truth; or whether they are cosmic forces; or whether they are the demands of times or historical necessities. All these will come under this word "مُرْسَلٰتِ" and they have been sent for a particular goal.

The meaning of the word عُرْفًا

My dear friends, in this verse (77:1) the third word is عُرْفًا. This is a strange word. The words عرف, معرفت, and عرفان are derived from this root. The basic root meaning of this word is 'to recognize'. But every time I come to root meaning of Arabic words I become ecstatic. These Arabs were a strange people and they produced an exceptional language. These people were nomadic desert Bedouins divided into several small tribes living here and there separated by wide deserts. They did not know which tribe was where. Sometimes a member of one tribe would come to some other tribe which was difficult to recognize. The only way to recognize someone under these circumstances was that if he came often. This word "عُرْفًا" means; something that keeps coming often. That is how a person who kept coming often was "recognized". And thus, the word "عُرْفًا" meant "to become recognized". What a people; and what a language they came up with?!

Now, with this explanation, the meaning of the verse وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (77:1) becomes clear: that which was sent often without any gaps or discontinuity. As I mentioned they could be Allah's messengers; or they could be human groups that stand for the message of truth; or they be cosmic forces or the demands of times or historical necessities – whatever meaning is suitable in a particular context that could be taken.

Here it means that continuous struggle between truth (حق) and falsehood (باطل) has been going on forever; and so have the forces sent by Allah in support of the truth (حق). If word "عُرْفًا" is taken as "to recognize" then it also means that the signs the Quran has mentioned for these forces could be used to recognize them. When one defines the natural forces or human teams that rise up in support of truth (حق) they will be become معروف or "recognized". The prerequisite is that they must be carriers of Allah's message and act as messengers (مرسل) to accomplish His program; whether they are human messengers; or ordinary human beings fighting for truth, or Cosmic forces – all of them could be recognized and they should keep coming continuously. And what will they provide the evidence for? They will overcome the forces of evil and establish the system of truth (حق), the Din (دین): فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (77:2).

Separating truth (حق) from falsehood (باطل)

My dear friends, separating truth from falsehood has been presented by the Quran in a very visual and realistic manner. It says that initially the truth (حق) and falsehood (باطل) are amalgamated together such that it is impossible to recognize the truth. Falsehood enwraps truth into itself which people then start believing as truth, but, in reality, it continues to remain falsehood. Now let us see the visual picture presented by this amazing language to explain this separation process. The kernels of wheat remain hidden inside the chaff. First, thrashing is done to loosen the grain from the husks and straw. In old times this was done using animals that walked continuously round and round over the harvested crop. When the chaff was loosened up by this thrashing process then wind winnowing was done for separating grain from chaff by throwing the mixture into the air so that the wind blows away the lighter chaff, while the heavier grains fall back down for recovery. Techniques included using a winnowing fan (a shaped basket shaken to raise the chaff) or using a tool (a winnowing fork or shovel) on a pile of harvested grain. This is the process by which the chaff is removed from the grain. This is also precisely the process the Quran describes for removing falsehood from truth. Using force is not going to work as this will crush the grain. What to say of the Arabic language and the selection of words by the Quran! It says: فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (77:2). These ongoing continuous forces – what do they do? They separate the chaff from the grain. This process requires great patience.

Only a farmer can tell how much patience this process requires. In the heat of summer bulls keep walking round and round from morning to evening in the thrashing process. The bulls do not get as much tired by tilling the land than by going round and round in circles during the thrashing process. It looks as if nothing is coming out of this process until the winnowing starts. But there is no short-cut to this process. There are also no short-cuts to removing falsehoods from the truth. That is why the Quran emphasizes to be patient so much. It tells the prophet (PBUH): فَاصْبِرْ (76:24) – to be steadfast; to not hurry; that if you will hurry then the grains will break; so, tread on this path slowly but unceasingly. *This* is the process of removing falsehood from truth. *This* is the process of separating Din (دین) from religion (مذہب).

Reforming religion (مذہب) does not produce Din (دین)

My dear friends, people feel so dominated by religion (مذہب) that no one wants to listen to Din (دین). This is the case because religion (مذہب) always appears in the garb of Din (دین). As noted above, these two have to be separated. People do not listen to Din (دین) because the process to separate them is not in place. Therefore, even those who are disgusted or disappointed with religion do not listen to Din (دین). They start demanding to reform religion as if some parts of Islam have become defective, and if they are set right then this system of religion will somehow become okay. They do not understand that the entire system of what we call religion is the opposite of the system of Din (دین); not that some parts of religion have become bad. Please understand this, my dear friends! According to the Quran by reforming religion it does not become Din. Din comes in *place* of religion. The Quran has said: جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (17:81) – when the truth comes the forces of falsehood and evil perish. What to say of any comprise, the truth, the Din (دین) replaces the entire system of religion (falsehood) and this is done by the مُرْسَلاتِ – Allah's messengers and their companions; and cosmic forces; and the demands of times or historical necessities. They carry out the separation of Din (دین) from religion (مذہب); of truth (حق) from falsehood (باطل). This is called revolution of the hearts and minds. This is called the revolution of thoughts. The Quran calls it the revolution of the soul or the psyche. The first revolution is that the "grain" and the "chaff" should be separated from each other. One should then clearly know that "the grain is Din" and the "chaff is religion". Then only one will know that by reforming religion one cannot establish Din. Din

gets established *in place of* religion.

When light comes darkness disappears

My dear friends, as shown above Din (دین) cannot get established by reforming religion (مذہب). Religion has to be replaced by Din. This point is extremely important but it is missing from our discourse. All our emphasis is on reforming religion. Even those who are sincere think that there are some elements of religion that need reforming. After it is done then the religion of Islam will become true. Pleas know that this will never be the case. As we saw, Islam and religion are opposite to each other. When light comes there is no trace of darkness. Islam is light. Religion is darkness. They cannot remain together by their very nature. If one is there, the other will not be there. Either there will be truth or there will be falsehood. Mixing the truth with falsehood creates nothing but falsehood; and the effort is wasted too. So, the first step must be to completely separate them. And the process for this is: فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (77:2) – to separate the "grain" from the "chaff".

My dear friends, do you notice how much realities are concentrated in the meaning of every word in these last verses of the Quran? And only Arabic language could have been apposite to convey these concentrated realities in few words. So: فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (77:2) – the "grain or the truth" will get separated from "chaff or falsehood"; and those who are after falsehood their efforts go waste: حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (2:217). The truth or the "grain" that sustains life will be carried far and wide: وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (77:3) – by the مُرْسَلَاتِ – i.e., by Allah's messengers; by cosmic forces; and by the demands of times. They do not keep the life-giving sustenance to themselves but they spread it to all the humanity. This is a universal economic system which is directly opposite of capitalistic system where: جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:2) – one collects wealth and keeps on counting; and does not spread it to humanity. That is: وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (70:18) – he amasses wealth and thereupon withholds it from their fellow human beings. Thus, we have two economic systems – one based on the truth (حق) and the other on falsehood (باطل) – and between the two the confrontation continues forever.

The enlightened aspect of the Quranic system in contrast to falsehood (باطل)

My dear friends, as opposed to the system based on collecting and hoarding wealth, the second system is based on the fact that only that action survives; that only that

system survives which is beneficial to entire humanity: وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17). The age in which we are living is the age of science and technology; it is the age in which the forces of nature have been conquered. In other words, the truth (حق) of science has taken over the falsehood (باطل) of superstitions; that is, the "grain" has been separated from the "chaff". But after this, what has been done? Capitalism has been imposed not only on individuals but on nations as well. Nations are trying to use science and technology to exploit other nations. This is the result of following a system based on falsehood. The system based on truth, on the other hand, is: وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) – only that system survives, which is universally beneficial; and remains open and accessible to entire humanity: The truth or the "grain" that sustains life is made available to all and is broadcast far and wide: وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (77:3). And this way this system creates clear-cut separation of itself from all other systems: فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا (77:4) – thus separating right and wrong with all clarity. This universal Quranic open system is thus completely and crisply separated from all the other systems that are based on falsehoods; whether capitalism, socialism, communism, or any other "ism".

History as evidence

What is the evidence that the Quran presents in support of its claim. It says: Any system that is based on falsehood cannot succeed, cannot grow, and cannot survive; the system of truth that it presents – that is, the system presented by Allah – will be the only one that will stay; will be the one that will survive. This is a huge claim. The question is: What is the evidence? The answer is provided by the Quran: فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا (77:5) – and then giving forth a reminder. The proof will come from the pages of history of messengers: starting from Noah (PBUH) through to Prophet Muhammad (PBUH). But this is not a record of history for academic exercise that one studies to pass an examination. The Quran presents this as philosophy of history. It says that such and such nations established false systems and were destroyed whereas others established the system of truth of universal justice and succeeded and prospered; acquired power and dignity. This is what history tells.

The Quran has preserved history in its pages from this point of view. It presents the stories of the Messengers and their nations to prove its universal law of requital related to nations: the result is related to the nature of system established – a system

based on truth produces good result, and a system based on falsehood produces bad result. Those who start the process of establishing the truth provide this evidence from history of past nations for their claim. I have mentioned this many times that the Quran repeats the history of only those nations whose ruins existed around the Arab people and they were familiar with their history. The Quran says that you wander through the ruins of their destroyed towns; you talk about them. But you do not understand as to why these powerful nations were destroyed. You talk about the *details* of their destruction, but We are telling you *why* they were destroyed? If only you could understand this "*why*"; if only you could reform and do not engage in similar activities as these destroyed nations did; then you would be able to save yourself!

My dear friends, the Quran says here: فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا (77:5) – and then giving forth a reminder. The question is: Why are the Prophet (PBUH) and his companions giving them this reminder? The answer is that they are putting their adversaries on notice: عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (76:6) – freedom from blame or offering a warning! They are telling them: whether you want to be saved by reforming yourselves or you want to be destroyed by following your current path – the choice is yours. Do you see my friends! That in just two words the Quran has put so much detailed descriptions of the past, and the promise for the future? After saying all this, the Quran very tellingly says: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (76:7) – BEHOLD! All that you are told to expect will surely come to pass. What has been presented before you provides the evidence for this outcome.

The difference between religion and Din will have to be determined first

My dear friends, the Quran has explained here the proper way to understand it; and to bring evidence form history in support of that understanding. Therefore, this is the way we should understand the Quran. Let me emphasize again: first and foremost, please define precisely: What Truth (حق) is and what falsehood (باطل) is; what Din (دین) is and what religion (مذھب) is. Then, from this point of view: study the history of past nations; study the details of the Prophets and their mission; study the details of Salah (صلاہ) and its purpose etc... Then the Quran will tell which of these were based on falsehood and which were based on truth; and what happened to them. It will also tell which systems were peddling "chaff" and which were offering "grain". If we study the Quran like this then the realities will spring forth in front of us. These

realities will also become the evidence for the future outcome of the system that we have established ourselves at present.

My dear friends, it is not the case that Allah destroys whichever nation He wants to. That everything with it was hanky dory and all of sudden it is gone. Nations are destroyed over a long period of time because of their false systems and misbehavior. The scale slowly tilts in the way of their destruction while they do some good things along the way. It takes time to reach the threshold for destruction. The مُرْسَلٰتِ – i.e., Allah's messengers; cosmic forces; and the demands of times – keep warning them "that the scale of justice is tilting in the direction of destruction and the day it reaches the threshold your destruction will happen. This is surely bound to happen if you do not listen." – إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ (76:7) – BEHOLD! All that you are told to expect will surely come to pass. What will happen when this destruction finally comes to pass: فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ (77:8) – all the stars of opposition and purveyor of falsehoods will be effaced. Now, this needs some explanation.

The realities given in the Quran should be viewed through metaphorical meanings also

My dear friends, traditional translations of this verse (77:8) use literal meaning of النُّجُومُ but in Arabic language there are metaphorical meanings of this word as well. It is not that one can take any meaning one wants to. No one has the right to do that. This book, Al-Quran, is revealed in what the Quran calls هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ (16:103) – this is Arabic language, clear in itself and clearly showing the truth of its source. Anyone translating using metaphorical meaning must produce lexical authority from لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ. In the last part of the Quran there is frequent mention that the Earth will be rent asunder; that stars will be effaced; that the Sun and the moon will be eclipsed; and that the sky will blow up, etc. Our traditional translations take the literal meaning of these things, and say that these things will when the Day of Judgment (قیامت) occurs. It is true that the Universe and celestial objects are not going to stay forever. They are going to end one day as the Quran tells, and which modern science attests. But the Quran is the guidance for humanity. What kind of guidance are we getting from it when it says that after billions of years the Earth will be rent asunder; stars will be effaced; Sun and the moon will disintegrate; and that the sky will be blown up? What is the guidance in it for us today? When all that happens people living at the

time cannot do anything about it anyway? But the Quran, in its every word, has been sent as guidance for humanity for all ages. So, what is the guidance revealed in these verses for us today? What lessons can we derive from them?

My dear friends, this is an extremely important question. What is the guidance in it for us today? The Quran says that historical evidence shows that this event is bound to happen. And the opponents of the Prophet (PBUH) are being told that this started from the time the revelations started coming down culminating in the victory of Mecca. After that it continued during the period of the rightly-guided (الراشدون) Caliphs. So, what really happened? The so-called sovereign satellites states that surrounded the Arabs those days were, in reality, subservient to the two superpowers of the day: Persian and Roman empires. These empires were dictating the foreign policies of these satellite states. With the support from their Iranian and Roman masters they used to cause troubles to the Arabs. This is the same strategy that goes on today as well. When the voice of truth and justice of Islam was proclaimed by the Prophet (PBUH), then initially, it were these minor satellite states which were surrounding the Arabs that were defeated. In Arabic language the Sun and the moon are used to mean big and powerful states; mountains are used to mean powerful tribal leaders; and stars to mean little or minor states. Here the Quran says: فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ (77:8) – first, these minor states will be ended. The history bears testimony to this interpretation of events of the Quran. And we know that there is a lesson and guidance in it for us. The Koresh fought until the last moment and they are being told that you can yourself see how these little stars representing the minor states were effaced; how the moon (symbol of Koresh) was split; and how the sun (symbol of Iran) was snuffed. This is what the Quran is saying: neither the Roman, nor the Iranian, nor the Egyptian empires survived, and their systems based on tyranny and exploitation and subjugation were also obliterated. Today, that is the same process which continues. The big superpowers are doing the same thing today. They push little powers on their behalf to carry out their policies of domination and control as their proxies. So, the Quran says: فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ; وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ; وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (77:8-10) – minor states will be effaced; major powers will be rent asunder; and powerful leaders will be scattered like dust. You may say, okay! All these happened, so what? Well, don't ask me but ask history what lessons it taught these minor and major

powers of the time. They are still licking their wounds until today. That history has become the real teacher and warner to all.

The album of history has many lessons to teach

My dear friends, please see Brown's history of Persia. If not, then just see the Pharaoh's history. There are many histories of the past nations. Take for example, the History of Roman Empire by Gibbon. These have great historical records. And these historians want to know what the causes of their decline and destruction were. They have enumerated the causes, and these are exactly the same that the Quran calls falsehood – they had implemented a system of falsehood. When the system based on the truth was established in Arabia then its effects spread far and wide. This is why the Quran says: وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (77:3) – The truth of that system travelled far and wide and all those systems that were based on falsehood got destroyed. And any nation that establishes such a system *will* suffer similar fate.

My dear friends, the big question is: When will it happen? This is Allah's system; it is nature's system; it is universal system. All these systems are not working randomly or by chance. This is a topic for further research. I pray and wish that I am able to see the results of this research in my lifetime. The Quran has said that the Universe and everything in it are busy continuously working so that no one's action remains unrecompensed: اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (10:4). This is a great thing. We have not reached to the level of individuals although we now understand why and how nations dominate or get destroyed. The Quran says: وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (77:11) – "Messengers are sent for this purpose. They will determine the program of action. It is your duty to implement it and execute with proper schedule and discipline." Then they ask: لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ (77:12) – For what day has the term of all this been set? They ask: Why then this destruction is not coming?

My dear friends, this is the self-deception of those who ask: why that promised revolution is not coming soon? Why is there delay in its arrival? It is because Allah is merciful; He is graceful. This delay is because of His infinite wisdom and grace; this is because He is the God of the Quran; this is because of the respite built into the law of requital of Allah. And *this* is pure mercy of the Almighty Allah towards humans that He does not punish them right away after their first crime.

My dear friends, there are two forces inside humans that remain under constant struggle: constructive forces and destructive forces. Medical science says that millions of harmful pathogens such as bacteria and viruses enter humans in very breath but our immune system protects us from infection with layered defenses. This is how humans remain healthy. If our defense mechanism is not able to fight back these harmful pathogens then we become sick until one day the human body is no longer able to defend, and it dies. The same law applies to nations as well. A nation does not get destroyed the very first time it does wrong. It takes a long time for nations' destructions. This is called period of respite. It is not that nothing is happening during that period. The law keeps doing its job incessantly until one day the patient dies.

My dear friends, this started with the opponents' question: why the destruction is not coming? They are asking when this period of respite is going to end; that how long we will have to wait. The Quran gives the answer: لِيَوْمِ الْفَصْلِ (77:13) – they are being warned now but the day of the decision will come soon when the truth and falsehood will get separated. Then there will no turning back except that there will be only death and destruction. That day will be the day of the last breath. Why are you asking to hurry it? Is it the sighting of a festival moon that you want to hurry? This is your day of death and destruction? This is the day of decision (فصل).

My dear friends, after this the Quran immediately says: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ (77:14) – who will tell them what that day of decision (فصل) will be? What will happen that day? وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:15) – those who belie such clear realities of Din (دین) will face death and destruction. I had mentioned many times before that denying is one thing: One does not accept the message. But belying is quite another. One *does* accept the message. One says that he is a Muslim; that he believes in Allah, the Quran and the Hereafter. Everything is fine except that he implements an opposite system in real life, both individually as well as collectively. The Quran says that he keeps himself under delusion and self-deception. He belies his claim by his own actions. That day of فصل will be the day of destruction for such people. Ask them: اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ; ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ (77:16-17) – Does not history tell We destroyed so many of those past nations? And We shall let them be followed by another nation, another people. We warned them. We told them not to repeat the mistake of past nations. But

they did not listen. So, we destroyed them also.

My dear friends, this destruction is not limited to only the past nations. Allah's principle is this: كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ (77:18) – thus do We deal with such criminals. Wherever may be the criminal from; whenever he may have committed his crime; whichever nation he may belong to; whichever period he may belong to – Our dealing is the same? In its dealing with criminals Our law of requital is fair and just to one and all.

The meaning of crime (جرم)

My dear friends, now we know what the meaning of "evidence of history" is? This is unalterable Allah's law of requital. This law applies equally to all criminal nations or peoples. There are different aspects of crime. There are many different kinds of crimes. But the Arabs used to call crime (جرم): to pick the fruit of someone else's tree and taking it for oneself. Every kind of crime as well as details of any crime are included in this definition i.e., to grab the fruit of the labor of others by force; to loot and exploit others. This is called crime (جرم) according to the Arabic language. What to say of these Arab people? What could be greater crime that leads to destruction of nations? The Quran says: (77:18-19) كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ; وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ – there will be destruction for all the criminals in that period (of universal justice) because they belied Our laws by their actions. Just think my dear friends! They were proclaiming the name of Islam but were plucking the fruits of others' labors and depriving the real owners of those fruits. Destruction was going to come one day anyway because of their crimes. And it did come.

My dear friends, the time is over for today's lecture. We have come up to verse 19 of Surah Al-*Mursalaat* (المرسلات). We will take up from verse 20 in our next lecture where the Quran has given an event as evidence from everyday life. You will see what a wonderful style the Quran has!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL® AND QUAID-E-AZAM®

CPL NO. 28
VOL.67
ISSUE
9

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666 , 042-35764484
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ O

ہم وہ نہیں جو ڈر جائیں حالات کے خونی منظر سے جس حال میں جینا مشکل ہو اس حال میں جینا لازم ہے